# الرسالہ

Al-Risāla

September 2000 • No. 286 • Rs. 10

جس کے پاس بھلا دینے کے لئے کچھ نہ ہو وہی سب سے زیادہ غیر تعلیم یافتہ انسان ہے۔

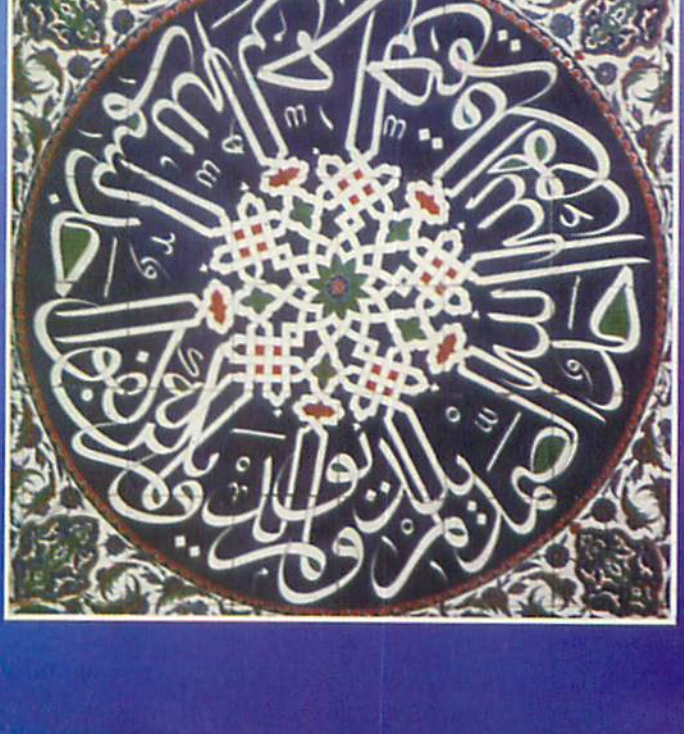

# عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

| | |
|---|---|
| تذکیر القرآن (مکمل) | 400.00 |
| مطالعۂ سیرت | 60.00 |
| اسباق تاریخ | 85.00 |
| تعمیر حیات | 60.00 |
| تعمیر انسانیت | 50.00 |
| سفرنامہ غیر ملکی اسفار، جلد دوم | 125.00 |
| اسلام: ایک تعارف | 80.00 |
| اللہ اکبر | 45.00 |
| پیغمبر انقلاب | 50.00 |
| مذہب اور جدید چیلنج | 55.00 |
| عظمت قرآن | 35.00 |
| عظمت اسلام | 50.00 |
| عظمت صحابہ | 7.00 |
| دین کامل | 60.00 |
| الاسلام | 45.00 |
| ظہور اسلام | 50.00 |
| اسلامی زندگی | 40.00 |
| احیاء اسلام | 35.00 |
| راز حیات | 65.00 |
| صراطِ مستقیم | 40.00 |
| خاتونِ اسلام | 60.00 |
| سوشلزم اور اسلام | 50.00 |
| اسلام اور عصر حاضر | 30.00 |
| الربانیۃ | 40.00 |
| کاروانِ ملت | 45.00 |
| حقیقت حج | 30.00 |
| اسلامی تعلیمات | 35.00 |
| اسلام دور جدید کا خالق | 25.00 |
| حدیث رسول | 40.00 |
| سفرنامہ (غیر ملکی اسفار) | 85.00 |
| راہ عمل | 25.00 |
| تعبیر کی غلطی | 80.00 |
| دین کی سیاسی تعبیر | 20.00 |
| عظمتِ مومن | 7.00 |
| اسلام: ایک عظیم جدوجہد | 5.00 |
| تاریخ دعوت حق | 5.00 |
| مطالعہ سیرت (کتابچہ) | 12.00 |
| ڈائری (جلد اول) | 80.00 |
| کتاب زندگی | 65.00 |
| اقوالِ حکمت | 25.00 |
| تعمیر کی طرف | 8.00 |
| تبلیغی تحریک | 20.00 |
| تجدید دین | 25.00 |
| عقلیاتِ اسلام | 35.00 |
| قرآن کا مطلوب انسان | 8.00 |
| دین کیا ہے؟ | 7.00 |
| اسلام دین فطرت | 7.00 |
| تعمیر ملت | 7.00 |
| تاریخ کا سبق | 7.00 |
| فسادات کا مسئلہ | 5.00 |
| انسان اپنے آپ کو پہچان | 5.00 |
| تعارف اسلام | 5.00 |
| اسلام پندرہویں صدی میں | 5.00 |
| راہیں بند نہیں | 12.00 |
| ایمانی طاقت | 7.00 |
| اتحاد ملت | 7.00 |
| سبق آموز واقعات | 7.00 |
| زلزلہ قیامت | 10.00 |
| حقیقت کی تلاش | 10.00 |
| پیغمبر اسلام | 5.00 |
| آخری سفر | 7.00 |
| اسلامی دعوت | 7.00 |
| حل یہاں ہے | 10.00 |
| امہات المومنین | 20.00 |
| تصویر ملت | 85.00 |
| دعوت اسلام | 50.00 |
| دعوت حق | 40.00 |
| نشری تقریریں | 80.00 |
| دین انسانیت | 60.00 |
| فکر اسلامی | 50.00 |
| شتم رسول کا مسئلہ | 50.00 |
| طلاق اسلام میں | 5.00 |
| مضامین اسلام | 60.00 |
| حیات طیبہ | 7.00 |
| باغ جنت | 7.00 |
| نار جہنم | 7.00 |
| سچا راستہ | 8.00 |
| دینی تعلیم | 7.00 |
| خلیج ڈائری | 10.00 |
| رہنمائے حیات | 7.00 |
| تعدد ازدواج | 7.00 |
| ہندستانی مسلمان | 50.00 |
| روشن مستقبل | 7.00 |
| صوم رمضان | 7.00 |
| اسلام کا تعارف | 5.00 |
| علما اور دور جدید | 10.00 |
| سفرنامہ اسپین و فلسطین | 60.00 |
| مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے | 12.00 |
| سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ | 10.00 |
| یکساں سول کوڈ | 5.00 |
| اسلام کیا ہے؟ | 8.00 |
| میوات کا سفر | 35.00 |
| قیادت نامہ | 35.00 |
| منزل کی طرف | 5.00 |
| اسفار ہند | 125.00 |
| ڈائری ۹۰-۱۹۸۹ | 100.00 |
| قال اللہ و قال الرسول | 70.00 |

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خصوصی شمارہ: دینی مدارس

الرسالہ، ستمبر ۲۰۰۰

# فہرست


| | |
|---|---|
| آغاز کلام | 3 |
| تاریخ تعلیم | 7 |
| دینی مدارس | 12 |
| تحریک مدارس کا آغاز | 15 |
| شریعت کی رہنمائی | 20 |
| علماء کا قائدانہ کردار | 25 |
| علم کا چشمۂ رواں | 30 |
| فوائد و برکات | 34 |
| دینی مدارس کا امتیاز | 49 |
| مدرسہ کلچر | 55 |
| تجربات کی روشنی میں | 60 |
| غیر سیاسی ایمپائر | 68 |
| مدارس سینٹر | 74 |



# الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 462 5454, 461 1128
Fax 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk
Composed by *Imran Ahmad (Islahi)*

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2523435
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.

# آغاز کلام

پہلی بار جب میں ایک بڑے مدرسہ میں گیا تو اس کو دیکھ کر اچانک میری زبان سے نکلا—— مدینۃ العلم (علم کا شہر)۔ ہر مدرسہ گویا علم کا ایک شہر ہے، اس واحد فرق کے ساتھ کہ ان میں سے کوئی بڑا شہر ہے اور کوئی چھوٹا شہر۔

دور اول میں جب مسلمان مختلف ملکوں میں پھیلے تو ہر جگہ انہوں نے اس قسم کے علمی شہر قائم کئے۔ یہ تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ تھا۔ قدیم زمانہ میں عمارت کے نام سے یا تو بڑے بڑے بت کدے (Temples) بنائے جاتے تھے یا محل اور قلعے اور مقبرے۔ جدید معنوں میں تعلیم گاہیں بنانے کا کوئی رواج ہی قدیم زمانہ میں نہ تھا۔ ایک مغربی محقق نے بجا طور پر لکھا ہے کہ صد فی صد تعلیم (hundred percent literacy) کا تصور پہلی بار مسلمانوں نے تاریخ میں پیدا کیا۔

مسلمانوں کے اندر یہ علمی مزاج کہاں سے آیا۔ یہ براہ راست قرآن کا نتیجہ تھا۔ قرآن کو کھلے ذہن کے ساتھ پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن میں سب سے زیادہ زور علم اور تعلیم و تعلم پر دیا گیا ہے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن پہلی کتاب ہے جس نے علم کو محدود دائرہ سے نکالا اور تاریخ انسانی کو عمومی تعلیم (mass education) کے تصور سے آشنا کیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ۵۷۰ء میں عرب کے شہر مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ پر پہلی وحی ۶۱۰ء میں اتری جب کہ آپ غار حرا میں تھے۔ وحی کا پہلا لفظ یہ تھا: اقرأ (پڑھ)۔ روایات میں آتا ہے کہ خدا کے فرشتہ جبریل نے آپ کے پاس آکر کہا کہ اقرأ (پڑھ) آپ نے فرمایا کہ: ماانا بقارئ (صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی) یعنی مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ جبریل نے دوبارہ کہا کہ اقرأ۔ آپ نے فرمایا کہ ماانا بقارئ۔ جبریل نے تیسری بار کہا کہ اقرأ۔ اس کے بعد آپ نے سورۃ العلق کے وہ کلمات اپنی زبان سے دہرائے جو جبریل پہلی وحی کے طور پر آپ کے پاس لائے تھے۔

ابتدائی وحی کے اس واقعہ پر غور کیجئے۔ پیغمبر اسلام ثابت شدہ طور پر ایک امی تھے۔ اس کے باوجود کیوں خدا کا فرشتہ بار بار کہہ رہا ہے کہ اقرأ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پڑھنا نہیں آتا تب بھی پڑھو۔

لکھنا نہیں جانتے تب بھی لکھو۔ اس اعتبار سے اسلامی کلچر گویا 'اقرأ' کلچر کا دوسرا نام ہے۔

یہ ایک انتہائی انقلابی تعلیم تھی جو پیغمبر اسلام ﷺ کو اور بالواسطہ طور پر آپ کے پیروؤں کو آغاز رسالت میں اللہ کی طرف سے ملی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم آپ کے پیروؤں کی سرگرمی کا ایک مستقل حصہ بن گیا۔ پڑھنے اور لکھنے کا رواج اتنا بڑھا کہ وہ وقت آیا جب کہ مسلمان تمام قوموں کے معلم بن گئے۔ اہل اسلام جب عرب سے نکلے اور دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے تو ہر جگہ انہوں نے پڑھنے اور پڑھانے کو اپنا خصوصی مشن بنالیا۔ یہ لہر مکہ سے اٹھی۔ پھر وہ مدینہ پہنچی۔ اس کے بعد وہ دمشق پہنچی۔ اس کے بعد بغداد اور قاہرہ اس کا مرکز بنا۔ اس کے بعد وہ قرطبہ اور غرناطہ میں داخل ہو۔ وہاں سے مزید پھیل کر وہ سارے عالم میں پہنچ گئی۔ اس زمانہ میں مسلم دنیا کے تمام شہر تعلیم و تعلم کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

اہل اسلام کے اسی مزاج کا نتیجہ تھا کہ جب ان کے قافلے برصغیر ہند میں داخل ہوئے تو یہاں بھی انہوں نے کثرت سے شخصی اور اجتماعی طور پر مدرسے اور تعلیم گاہیں قائم کیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ برصغیر ہند میں علم کی عمومی اشاعت بھی پہلی بار مسلمانوں کے ذریعہ ہوئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اعتراف کیا ہے کہ عرب مسلمان انڈیا میں ایک شاندار کلچر (brilliant culture) لے کر آئے۔ (ڈسکوری آف انڈیا)

انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں جب برصغیر ہند میں انگریزوں کا غلبہ بڑھا تو اس کے ساتھ مسلم تعلیم گاہوں کا زوال شروع ہو گیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف ابتدائی سیاسی مزاحمت زیادہ تر علماء اسلام کی قیادت میں ہوئی تھی۔ اس سے انگریزوں نے یہ تصور قائم کیا کہ اسلامی مدرسے انگریز مخالف تحریک کے فکری مرکز ہیں۔ چنانچہ وہ مدارس کے دشمن ہو گئے۔ انہوں نے طرح طرح سے مدارس پر روک لگانے کی کوشش کی۔ مثلاً انہوں نے مدارس کی جاگیریں اور اوقاف ضبط کر کے ان کے ذرائع کو مسدود کر دیا۔ بہت سے علماء کو گرفتار کر لیا، وغیرہ۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ بڑی تعداد میں اس ملک کے مدارس بند ہو گئے۔

ہندستان میں انگریزوں کے سیاسی قبضہ کے بعد ایک عرصہ تک مسلم رہنما یہ سوچتے رہے کہ پہلے انگریزوں کو ملک سے نکالو۔ اس کے بعد ہی اس ملک میں دوبارہ کسی دینی کام کے مواقع نکلیں گے۔ ۱۸۵۷ کا مسلح اقدام اسی طرز فکر کا نتیجہ تھا جو اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اس تجربہ کے بعد علماء نے محسوس

کیا کہ انگریزوں سے مسلح ٹکراؤ عملی طور پر غیر مفید ہے۔ اب واحد قابل عمل صورت یہ ہے کہ جنگ اور ٹکراؤ کو چھوڑ کر پر امن عمل کے میدان میں کوئی تعمیری کام شروع کیا جائے۔ اسلام کی روشنی میں انہیں نظر آیا کہ یہ کام صرف علم اور تعلیم کا کام ہے۔ چنانچہ علماء نے یہ فیصلہ کیا کہ انگریزوں سے ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر وہ قوم کو تعلیم یافتہ بنانے میں اپنی ساری طاقت صرف کریں۔

اس نئے ذہن کے تحت انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں پورے بر صغیر ہند میں مدارس کی تحریک پھیل گئی۔ داخلی اور خارجی حالات اس کے موافق ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ تحریک مدارس بڑھتے بڑھتے اب تحریک انقلاب کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

میں اپنی ابتدائی عمر ہی سے علماء اور تحریک مدارس سے بہت قریب رہا ہوں۔ میرے والد کا انتقال ۱۹۲۹ میں بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ اس لئے میرے عم زاد بھائی مولانا اقبال احمد خاں سہیل ایڈوکیٹ، ایم، اے، ایل ایل بی ہی گویا میرے خاندانی سرپرست تھے۔ وہ نہایت ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ وہ علماء کے بہت عقیدت مند تھے۔ انھوں نے مشہور عالم اور بزرگ مولانا حسین احمد مدنی کی تعریف میں ایک نظم لکھی تھی جس کا ایک شعر یہ تھا:

وارثِ انبیاء حسین احمد  کہ بدیں مستعار موتمن است

تقسیم ہند سے پہلے کے دور میں دو قومی نظریہ کا ہنگامہ اٹھا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے اس کا جواب دیتے ہوئے ۱۹۳۷ میں کہا کہ "نئی زمانہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ اس کے رد میں علامہ اقبال نے اپنا مشہور فارسی قطعہ لکھا جس کا پہلا شعر یہ تھا:

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ  زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

اس وقت اقبال احمد سہیل ایڈوکیٹ نے فارسی نظم کی صورت میں اس کا مدلل جواب دیا جس کے دو شعر یہ ہیں:

بہ دیوبند گرا، گر نجات می طلبی  کہ دیو نفس سلح شورو دانش تو صبی است

بگیر راہ حسین احمد ار خدا خواہی  کہ وارث است نبی راو ہم زآل نبی است

برادر بزرگ مولانا اقبال احمد سہیل مرحوم سے مجھے زندگی کی پہلی سوچ ملی۔ چنانچہ نوجوانی کی عمر ہی میں علماء اور تحریک مدارس سے میرا رشتہ جڑ چکا تھا جو پھر کبھی ختم نہ ہوا۔

مدرسہ کی دنیا سے مسلسل میرا ربط رہا ہے۔ میری تعلیم مدرسہ ہی میں ہوئی۔ مدارس سے وابستہ افراد سے مسلسل میری ملاقاتیں رہی ہیں۔ میں بار بار مدارس کے اجتماعات اور پروگراموں میں شریک ہوتا رہا، وغیرہ۔ مگر باضابطہ طور پر میں نے ابھی تک مدارس کے بارہ میں نہیں لکھا تھا۔ اس موضوع پر میری متفرق تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں مگر ابھی تک اس موضوع پر میں نے مستقل کتاب تیار نہیں کی تھی۔

مختلف مدارس سے تعلق رکھنے والے علماء اکثر مجھ سے یہ کہتے تھے کہ آپ مدارس کے بارے میں ایک کتاب یا مفصل مقالہ لکھیں۔ مگر اب تک میں یہ کام نہیں کر سکا تھا۔ آخر کار مئی ۲۰۰۰ میں ایسے اسباب پیدا ہوئے جس کے نتیجہ میں وہ کتاب تیار ہوئی جو اس وقت ناظرین کے سامنے ہے۔

تنظیم ابناء قدیم دار العلوم دیوبند کی طرف سے مجھے ایک دعوت نامہ مؤرخہ ۹ مئی ۲۰۰۰ موصول ہوا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ نئی دہلی میں ۲۰۔۲۲ مئی ۲۰۰۰ کو "الامام محمد قاسم النانوتوی سیمنار" کے عنوان پر ایک بین اقوامی اجتماع ہو رہا ہے۔ تنظیم کے ذمہ داروں کی طرف سے مجھے یہ دعوت دی گئی تھی کہ میں اس کے افتتاحی اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کروں اور ہندستان میں مدارس دینیہ کی تحریک کے موضوع پر وہاں خطاب کروں۔ اس کے بعد دہلی کے کئی فضلاء مدارس مجھ سے ملے۔ مثلاً مولانا عمید الزماں کیرانوی، مولانا محمد مزمل الحق الحسینی، مولانا بدر الزماں قاسمی، مولانا وارث مظہری قاسمی، وغیرہ۔ ان صاحبان نے اس کام کی طرف خصوصی توجہ دلائی۔ ان کی تحریک پر میں نے آخری فیصلہ کر لیا اور اس موضوع پر مطالعہ و تحریر کا کام شروع کر دیا۔

مذکورہ سیمنار میں پیش کرنے کے لئے جو تقریر میں نے تیار کی تھی وہ ابتداءً صرف ۱۰ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد موضوع کی مزید تحقیق کے دوران اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ۸۰ صفحات کی یہ کتاب تیار ہو گئی۔ یہ کتاب ابتداءً اردو میں شائع کی جا رہی ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ دوسری زبانوں میں بھی اس کی اشاعت کی جائے گی، وباللہ التوفیق۔

نئی دہلی، ۱۹ جولائی، ۲۰۰۰ — وحید الدین

# تاریخِ تعلیم

موجودہ زمانہ میں تعلیم (education) کی تاریخ پر کافی تحقیق کی گئی ہے اور اس موضوع پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کی تاریخ میں اسلام کا ایک بہت بڑا حصہ (contribution) ہے۔ اسلام نے معلوم تاریخ میں پہلی بار علم اور تعلیم کو محدود دائرہ سے نکال کر وسیع دائرہ تک پہنچایا۔ ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں اسلام کا ظہور ہوا۔ اسلام سے پہلے علم صرف خواص کے دائرہ کی چیز بنا ہوا تھا۔ اسلام کے تحت آنے والے انقلاب کے بعد تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ علم کو خواص کے دائرہ سے نکال کر عوام کے دائرہ میں لایا گیا۔ توسیع تعلیم کی یہی انقلابی تحریک ہے جس کو تعلیم کی تاریخ میں "مدرسہ" کہا جاتا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں تاریخ تعلیم (History of Education) پر ۹۲ صفحہ کا ایک مفصل مقالہ شامل ہے۔ اس کو متعدد ماہرین تعلیم نے تیار کیا ہے۔ اس مقالہ میں تعلیم کی تاریخ کو چند ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق، پہلا دور وہ ہے جس کو ابتدائی کلچر (primitive culture) کہا گیا ہے۔ اس ابتدائی دور میں تعلیم کا مقصد بنیادی طور پر یہ تھا کہ قبائلی روایات اور قبائلی اخلاقیات سے نئی نسل کو باخبر کیا جائے اور اس کے لئے اس کو تیار کیا جائے۔ اس زمانہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج بے حد کم تھا۔ چنانچہ یہ قبائلی تعلیم بھی زیادہ تر زبانی طور پر دی جاتی تھی اور ان کو محفوظ رکھنے کے لئے نوجوانوں کو یاد کرایا جاتا تھا۔

مزید یہ کہ اس تعلیم کا تعلق پورے قبیلہ سے نہ تھا بلکہ صرف اعلیٰ طبقہ سے تھا۔ اس اعلیٰ طبقہ میں بنیادی طور پر صرف دو قسم کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ ایک، قبیلہ کے سردار اور امراء اور اعلیٰ طبقہ (upper class) کے نوجوان اور دوسرے، مذہبی پیشواؤں کا طبقہ (priestly class) جو لوگوں کو مذہبی رسوم و آداب کی ادائیگی میں مدد دیتا تھا۔ عام افراد اس تعلیمی نظام سے خارج سمجھے جاتے تھے۔ (EB 6/317-18)

اس کے مطابق، دوسرا دور وہ ہے جس کو کلاسیکل کلچر کا نام دیا گیا ہے، یعنی قدیم تاریخی دور۔ اس

زمانہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج کافی بڑھ چکا تھا۔ مگر جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے اب بھی تعلیم کا انداز (pattern) بنیادی طور پر وہی باقی رہا جو ابتدائی دور میں تھا۔ اب غیر رسمی تعلیم کے علاوہ رسمی تعلیم کا رواج بھی شروع ہو گیا۔ مگر یہ تعلیم بنیادی طور پر اعلیٰ طبقہ اور اونچی ذات (higher castes) تک محدود رہی۔ اونچی ذات یا اونچے طبقہ میں دو قسم کے لوگ شریک سمجھے جاتے تھے۔ ایک، سردار اور امراء جو قبیلوں یا قوموں کے سیاسی لیڈر کی حیثیت رکھتے تھے، جو انتظام سلطنت کے ذمہ دار تھے۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو مذہبی مراسم کی ادائیگی میں پیشوا (priests) کا کام کرتا تھا۔ وہ عبادت گاہوں کا نظام چلاتا تھا اور دوسرے خاندانی یا سماجی رسوم مثلاً نکاح یا دوسری تقریبات کو مذہبی اصولوں کے مطابق ادا کرتا تھا۔ ان اعلیٰ مذہبی اور سیاسی طبقوں کے علاوہ قوم یا قبیلہ کے دوسرے افراد کے لئے تعلیم کو ضروری نہ سمجھا جاتا تھا۔

بعض قوموں میں عام لوگوں کی تعلیم کا رواج بھی ملتا ہے مگر یہ تعلیم حقیقۃً حصول علم کے معنی میں نہ تھی۔ وہ زیادہ تر سماج کی عملی ضرورت کے معنی میں تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ سماج کی روایات کو جانیں تاکہ وہ قائم شدہ سماج کے وفادار بن سکیں اور سماج انتشار سے بچا رہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عوام یہ جانیں کہ اعلیٰ طبقہ کی ماتحتی میں انھیں کس طرح زندگی گزارنا چاہئے۔ (6/319-320)

اس کے بعد تیسرا دور شروع ہوتا ہے جس کو حقیقی معنوں میں تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس دور کا آغاز بنیادی طور پر اسلامی انقلاب کے بعد ظہور میں آیا۔ اس نئے دور کے آغاز کے لئے جو لازمی صورت حال درکار تھی وہ یہ کہ انسان اور انسان کے درمیان تفریق کا خاتمہ ہو۔ اور اس تفریق کا خاتمہ صرف اسلام کے بعد ممکن ہوا۔ اسلام سے پہلے کا جو زمانہ ہے، اس وقت یہ حال تھا کہ انسانیت دو طبقوں میں بٹی ہوئی تھی ــــ اعلیٰ طبقہ (upper class) اور نچلا طبقہ (lower class) یا برتر نسل (superior race) اور کمتر نسل (inferior race)۔ مثال کے طور پر چین میں بادشاہ کو آسمانی اولاد (Son of Heaven) کہا جاتا تھا۔ ہندستان میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ کچھ لوگ اعلیٰ ذات (upper class) کی حیثیت رکھتے ہیں جو برہما کے سر سے پیدا ہوئے اور بقیہ لوگ درجہ بدرجہ اس کے نچلے دھڑ سے۔ تقریباً یہی حال دوسری قوموں اور ملکوں کا تھا۔ انسانیت کے درمیان اس تفریق و تقسیم کو پہلی بار اسلام نے ختم کیا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو عام طور پر مورخین نے تسلیم کیا ہے۔ اسلام

نے جب انسانیت کے درمیان تفریق و تقسیم کو توڑا، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ تعلیم خواص کے دائرہ سے نکل کر عوام کے دائرہ تک پہنچ جائے۔ وہ تمام انسانوں کے لئے قابل حصول چیز بن جائے۔

اس عمل کا آغاز عبادتی فعل سے ہوا۔ اسلام سے پہلے عبادت کی صورت یہ تھی کہ وہ ایک ایسا عمل سمجھا جاتا تھا جو براہ راست خدا اور بندے کے درمیان پیش نہیں آتا تھا بلکہ وہ ایک درمیانی واسطہ (mediator) کے ذریعہ انجام پاتا تھا۔ اس تقسیم کی بنا پر مذہبی علم صرف اسی مذہبی پیشوا (priest) کے لئے ضروری تھا جو درمیانی کردار ادا کر کے عبادت کے مراسم کی تکمیل کرے۔ یہی تقسیم تھی جس کی بنا پر پڑھنا لکھنا مذہبی پیشواؤں تک محدود رہا اور عوام اس سے بے تعلق بنے رہے۔

اسلام نے پہلی بار عبادت کو انسان اور خدا کے درمیان ہونے والا براہ راست عمل قرار دیا اس طرح لکھنا پڑھنا ہر انسان کی ذاتی ضرورت بن گیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ہر آدمی قرآن کو پڑھنے اور اس کو یاد کرنے لگا تاکہ وہ روزانہ اپنی عبادتوں میں قرآن کو پڑھے۔ دعا اور اذکار کے دوسرے کلمات کو بھی یاد رکھنے کے لئے لکھنے اور پڑھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی طرح اسلام نے زندگی کے دوسرے معاملات میں ایسی اصلاحات کیں جن کے بعد خود بخود انسانوں کے درمیان خواص و عوام کی تقسیم ختم ہو گئی۔

انسانوں کے درمیان بظاہر فرق دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً رنگوں کا فرق، صلاحیت کا فرق، درجہ کا فرق۔ ان فرقوں کی بنا پر تاریخ کے قدیم زمانوں میں یہ سمجھا جاتا رہا کہ کچھ لوگ اونچے ہیں اور کچھ لوگ نیچے۔ اسلام نے امتیاز پر مبنی اس تصور کا خاتمہ کیا اور کھلے طور پر یہ اعلان کیا کہ: اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے (الحجرات ۱۳)

یہی بات حدیث میں مختلف انداز میں آئی ہے۔ مثلاً پیغمبر اسلام نے فرمایا: ان العباد کلهم اخوة (سنن ابی داؤد) یعنی بلاشبہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اسی طرح آپ نے فرمایا: والناس بنو آدم و خلق الله آدم من تراب (الترمذی، کتاب التفسیر) یعنی تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا۔ اسی طرح آپ نے فرمایا: الا لا فضل لعربی علی اعجمی

ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر إلا بالتقویٰ۔ (مسند احمد ۵/۴۱۱) یعنی سنو، کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔ اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی سرخ کو کسی سیاہ پر اور کسی سیاہ کو کسی سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کی بنیاد پر۔

انسانی برابری کا یہ اعلان صرف اعلان نہ تھا بلکہ وہ ایک حقیقی عملی انقلاب کا مبنی فیسٹو تھا۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کو اللہ کی خصوصی مدد سے یہ موقع ملا کہ وہ انسانی مساوات اور اخوت کا نہ صرف اصولی اعلان کریں بلکہ زمین کے وسیع رقبہ میں انقلاب برپا کر کے اس کو عملاً قائم کر دیں۔ محققین نے عام طور پر تسلیم کیا ہے کہ انسانی مساوات کا عملی نظام تاریخ میں پہلی بار اسلام کے ذریعہ قائم ہوا۔

قدیم زمانہ میں علم اور تعلیم کا خواص کے دائرے میں محدود رہنا زیادہ تر انسانی عدم مساوات کی بنا پر تھا۔ جب نابرابری کا خاتمہ ہوا اور انسانی برابری کا دور آیا تو فطری طور پر وہ حالات پیدا ہو گئے جب کہ علم اور تعلیم کا دائرہ کسی مخصوص انسانی گروہ تک محدود نہ رہے، بلکہ وہ انسان کے تمام طبقوں تک پھیل جائے۔ اور اسلامی انقلاب کے بعد عملاً یہی پیش آیا۔ اسلام سے پہلے قدیم دور میں ہر جگہ بادشاہت (Kingship) کا نظام قائم تھا۔ کچھ لوگوں کو مطلق حکمراں کا درجہ حاصل ہوتا تھا، اور بقیہ لوگوں کے لئے صرف یہ تھا کہ وہ ماتحت رعایا بن کر زندگی گزاریں۔ امتیاز پر مبنی اس سیاسی نظام نے علم اور تعلیم کو امراء اور حکام کے دائرے کی چیز بنا دیا تھا۔ عوام کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔

اسلام نے اس آمرانہ نظام کے برعکس جمہوری شورائیت (الشوریٰ ۳۸) کا تصور پیش کیا۔ اور اس کو عملاً قائم کیا۔ مؤرخین نے تسلیم کیا ہے کہ قدیم بادشاہت کے نظام کا خاتمہ اسلامی انقلاب کے ذریعہ ممکن ہوا۔ مثال کے طور پر فرانسیسی مؤرخ ہنری پرین (Henri Pirenne) نے لکھا ہے کہ اسلام نے اگر بازنطینی ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کو توڑا نہ ہوتا تو دنیا سے شاید کبھی بھی سیاسی آمریت کا دور ختم نہ ہوتا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قدیم بادشاہی نظام کا ٹوٹنا اور اس کی جگہ پر جمہوری یا عوامی دور کا دنیا میں آنا صرف اسلامی انقلاب کے بعد ممکن ہوا۔ اس انقلاب کے مختلف سماجی نتائج تاریخ میں ظاہر ہوئے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ انسانی سماج میں خواص و عوام یا برتر طبقہ اور کمتر طبقہ کی تقسیم ختم ہو گئی۔ اس کے بعد عین اس کے فطری نتیجہ کے طور پر پڑھنے لکھنے کا رواج سارے انسانوں میں پھیل گیا، جو اس

سے پہلے خواص کے دائرہ کی چیز بنا ہوا تھا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانکا (۱۹۸۴) میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کے ظہور کے بعد مدرسوں یا درسگاہوں کا پھیلاؤ (expansion) بڑے پیمانہ پر ہوا۔ ابتداء میں تعلیم کے حلقے قائم ہوئے پھر ہر مسجد کے ساتھ ایک مکتب اس کے لازمی جزء کے طور پر بننے لگا۔ پھر مزید اضافہ ہوا اور مسجدوں میں قائم ہونے والے مکتب ناکافی نظر آئے تو کثرت سے مستقل مدرسے قائم ہونے لگے۔ عباسی دور تک پہنچ کر یہ سلسلہ مزید آگے بڑھا۔ اب بہت بڑے بڑے جامعات (universities) قائم ہونے لگیں۔ مثال کے طور پر نظامیہ اور مستنصریہ وغیرہ۔ (6/332-33)

خلاصہ یہ کہ اسلام سے پہلے مختلف توہمات (superstitions) نے انسانی سماج کو اونچے اور نیچے طبقوں میں بانٹ رکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم صرف اونچے طبقہ کے لئے مخصوص ہو گیا اور نچلے طبقہ کے لوگ ہزاروں سال تک جہالت میں پڑے رہے۔ ساتویں صدی میں ظاہر ہونے والے اسلامی انقلاب نے تاریخ میں پہلی بار ان توہمات کا خاتمہ کیا۔ اس نے انسانی زندگی کا نظام توہمات کے بجائے حقائق فطرت کی بنیاد پر قائم کیا۔ اس انقلاب کے جو مثبت نتائج ظاہر ہوئے انہیں میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ علم خواص کے طبقہ سے نکل کر سارے انسانی گروہوں میں پھیل گیا۔

مدرسہ کا لفظ تعلیم کی تاریخ کا اسی طرح ایک مسلمہ حصہ بن چکا ہے جس طرح ایجوکیشن (education) کا لفظ انگلش ڈکشنری کا ایک مسلمہ حصہ ہے۔ انٹرنٹ کو آج عالمی معلومات کا خزانہ سمجھا جاتا ہے۔ اگر آپ اس سے جڑے ہوئے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر مدرسہ (madrasah) کا لفظ ٹائپ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کی اسکرین پر اچانک مدرسہ کے بارے میں معلومات کا ایک دفتر سامنے آگیا ہے۔

# دینی مدارس

انیسویں صدی کے وسط سے لے کر اب تک بر صغیر ہند میں جو دینی یا اسلامی سرگرمیاں جاری ہوئیں ان میں غالباً سب سے اہم سرگرمی وہ تھی جس کو دینی مدارس کی تحریک کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کے قائد زیادہ تر علماء تھے۔ ان کی مسلسل کوشش سے اس پورے خطۂ ارض میں مدارس کا جال (network) قائم ہوگیا۔ چھوٹے بڑے مدارس اتنی کثرت سے وجود میں آئے کہ شاید کوئی بھی علاقہ اس سے خالی نہیں رہا۔

علماء اسلام نے صرف یہی نہیں کیا کہ ادارہ کی صورت میں باقاعدہ مدرسے قائم کئے، اسی کے ساتھ ان کی ذات بھی مسلسل طور پر لوگوں کے لئے علم اور تعلیم کا مرجع بنی رہی۔ حتیٰ کہ یہ گویا علماء کی روایت بن گئی کہ ان کا گھر لوگوں کے لئے تعلیم گاہ کا کام کرنے لگا۔ میں خود بھی مدرسہ کی باقاعدہ تعلیم کے علاوہ اپنی زندگی کے بیشتر حصہ میں مسلسل طور پر علماء اسلام سے وابستہ رہا ہوں۔ اور ان سے برابر علمی اور دینی استفادہ کرتا رہا ہوں۔

## علم کی اہمیت

اسلام میں علم کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اللہ کی شریعت پیغمبروں کے اوپر کتاب کی صورت میں اتاری گئی اور قلم کے ذریعہ اس کو لکھا گیا (العلق ۴-۵)۔ یہ قلم اور کتاب دونوں علم ہی کی علامت ہیں۔ وحی کو قلم اور کتاب سے وابستہ کرنا بذات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ دین خداوندی کی بنیاد علم پر قائم کی گئی ہے۔

قرآن میں علم کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں۔ یہ دو قسمیں اس آیت سے معلوم ہوتی ہیں: ایتونی بکتاب من قبل هذا أو اثارة من علم إن كنتم صدقين (الاحقاف ۴) یعنی میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ یا کوئی علم جو چلا آتا ہو، اگر تم سچے ہو۔

قرآن کی اس آیت کے مطابق، علم کا پہلا ماخذ آسمانی کتاب ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں الہامی علم (revealed knowledge) کہا جاسکتا ہے۔ یہاں الہامی علم سے مراد وہ الہامی علم ہے جو تاریخی طور پر ثابت شدہ ہو۔ محض دعویٰ کی بنیاد پر کوئی علم الہامی علم نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے آج

قرآن ہی الہامی علم کے حقیقی نمائندہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری مقدس کتابیں، تاریخی طور پر ثابت شدہ نہ ہونے کی بنا پر الہامی علم کے لئے معتبر ماخذ کی حیثیت نہیں رکھتیں۔

دوسرا علم وہ ہے جس کے لئے قرآن میں اثارۃ من علم کا لفظ آیا ہے۔ اثر کے معنی ہیں نقل کرنا۔ "اثارۃ" کی تشریح "المفردات فی غریب القرآن، الامام راغب" میں ان الفاظ میں کی گئی ہے: وھو ما یروی او یکتب فیبقی لہ اثر (صفحہ ۹) یعنی اس سے مراد وہ علم ہے جس کی روایت کی جائے یا جس کو لکھا جائے پھر اس کا اثر باقی رہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد غالباً وہ مبنی بر فطرت علم ہے جس کو موجودہ زمانہ میں مصدقہ علم (verified knowledge) کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ علم جو مسلسل تحقیق اور مشاہدہ اور تجربہ سے درست ثابت ہو یہاں تک کہ اہل علم کے درمیان اس کو عمومی قبولیت (general acceptance) حاصل ہو جائے۔ ان دونوں قسم کے علوم کو دوسرے لفظوں میں الہامی علم اور سائنسی علم کہا جاسکتا ہے۔

قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں ہی علم انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اتقوا اللہ ویعلمکم اللہ (البقرہ ۲۸۲) یعنی اللہ سے ڈرو اور اللہ تم کو سکھائے گا۔ قرآن کی اس آیت میں علم کا تعلق تقویٰ سے بتایا گیا ہے۔ یعنی جو آدمی اپنے اندر تقویٰ کی صفت پیدا کرے گا وہ علم سے بہرہ ور ہوگا۔ تقویٰ آدمی کے اندر سنجیدگی پیدا کرتا ہے۔ اور کامیاب علمی سفر میں سنجیدگی لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔

دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: و من الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانھا وغرابیب سود، ومن الناس والدواب والانعام مختلف الوانہ کذالک، انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (فاطر ۲۷-۲۸) یعنی اور پہاڑوں میں بھی سفید اور سرخ رنگوں کے ٹکڑے ہیں اور گہرے سیاہ بھی۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی مختلف رنگ کے ہیں۔ اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

اس آیت میں پہاڑ اور جانور (دوسرے لفظوں میں جمادات اور حیوانات) فطرت کے مظاہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فطرت کے مظاہر کا مطالعہ بھی اسی طرح خشیت اور تقویٰ کا

سرچشمہ ہے جس طرح الہامی کتاب کا مطالعہ۔

علم کی دو قسموں کی اس اہمیت کا تقاضا تھا کہ مدارس کے نصاب میں دو قسم کی کتابیں رکھی جائیں۔ چنانچہ علماء نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے ایک کو منقولات کہا اور دوسری کو معقولات۔ یہ تقسیم شرعی اور عقلی دونوں اعتبار سے بالکل درست ہے۔

مدرسہ یا تعلیم گاہ کے بارے میں قرآن کا تصور کیا ہے، اس کا جواب ہم کو قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے: وما کان المؤمنون لینفروا کافة فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون (التوبہ ۱۲۲) یعنی اور یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ سے ایک حصہ نکل کر آتا تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرتا اور واپس جاکر اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتا تاکہ وہ بھی پرہیز کرنے والے بنتے۔

قرآن کی اس آیت میں تفقہ فی الدین کا لفظ تقریباً اسی معنی میں آیا ہے جس معنی میں علم دین کے حصول کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس آیت کے مطابق، علم دین کے حصول کے مقاصد بنیادی طور پر دو ہیں۔ ایک یہ کہ طالب علم خود بخوبی طور پر اسلام کی تعلیمات سے واقف ہو۔ اس کی رسائی ان معارف و حقائق تک ہو جائے جو قرآن و سنت میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس کا دوسرا مقصد وہ ہے جس کو انذار قوم کہا گیا ہے یعنی پر امن طور پر تمام انسانوں تک اسلام کا پیغام پہنچانا۔ ہر پیدا ہونے والے انسان کو اس ہدایت سے باخبر کرنا جو خالق کائنات نے اسلام کی صورت میں نازل فرمائی ہے۔

انہی دو طرفہ تقاضوں کا یہ نتیجہ ہے کہ مدارس دینیہ میں ابتدا ہی سے یہ تصور رہا ہے کہ ان مدارس کے فارغین بیک وقت دو صفات کے حامل ہوں۔ وہ عالم بھی ہوں اور اسی کے ساتھ داعی بھی۔ ایک طرف وہ علم دین میں قابل اعتماد دستگاہ حاصل کریں اور دوسری طرف وہ اپنی پڑوسی قوموں تک اسلام کا پیغام پہنچائیں۔

# تحریکِ مدارس کا آغاز

۱۹ویں صدی عیسوی میں بر صغیر ہند کے مسلمان بیک وقت کئی سنگین مسائل سے دوچار ہوئے۔ ایک طرف لمبی مدت سے قائم شدہ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو گیا۔ دوسری طرف برٹش حکومت نے ملک پر مکمل قبضہ کر لیا، وغیرہ۔ ان حالات میں مسلمان سخت ذہنی انتشار کا شکار تھے۔ ان کے سامنے کوئی واضح راہ عمل (line of action) موجود نہ تھی۔ ایسے نازک وقت میں علماء اسلام نے اللہ کی توفیق سے بر صغیر ہند کے مسلمانوں کو سمت کا شعور (sense of direction) دیا۔

مسلم اقتدار کے خاتمہ کے بعد یہ علماء نئے دور میں مسلمانوں کی نشاۃ جدیدہ کے معمار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے مقدر کر دیا تھا کہ وہ انیسویں صدی میں پیش آنے والے مسلم زوال کے نتائج کا براہ راست مشاہدہ کریں تاکہ وہ نئے دور میں مسلمانوں کی حیات نو کی مبنی بر حقیقت منصوبہ بندی کر سکیں۔

علماء ہند نے مدارس کے قیام کے سلسلہ میں جو کوششیں کیں وہ انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس مدت میں جو مدرسے قائم کئے گئے، ان میں سے صرف چند ابتدائی مدارس کا ذکر یہاں بطور مثال کیا جاتا ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ دار العلوم | دیوبند | ۱۸۶۶ |
| ۲۔ دار العلوم ندوۃ العلماء | لکھنؤ | ۱۸۹۴ |
| ۳۔ مدرسۃ الاصلاح | سرائے میر، اعظم گڈھ | ۱۹۰۹ |
| ۴۔ مدرسہ باقیات الصالحات | ویلور، تامل ناڈو | ۱۸۸۳ |
| ۵۔ دار العلوم خلیلیہ نظامیہ | ٹونک | ۱۸۹۹ |
| ۶۔ مدرسہ امینیہ | دہلی | ۱۸۹۷ |
| ۷۔ مظاہر العلوم | سہارنپور | ۱۸۶۶ |
| ۸۔ جامعہ دار السلام | عمر آباد | ۱۹۲۴ |
| ۹۔ جامعہ مظہر العلوم | بنارس | ۱۸۹۳ |
| ۱۰۔ جامعہ عربیہ حیات العلوم | مبارک پور | ۱۸۹۹ |

یہ مدارس سادہ طور پر صرف مدارس نہ تھے بلکہ وہ ملت مسلمہ کو ایک مثبت میدان کار کی طرف رہنمائی دینے والے تھے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس دور کے علماء کا گروہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کے لئے رائد (trend setter) کے مقام پر کھڑا ہوا نظر آئے گا۔

اس ابتدائی دور کے علماء نے مدارس کی صورت میں جو تعلیمی ادارے قائم کئے وہ پورے ملک میں ایک قسم کی تعلیمی بیداری کا ذریعہ بن گئے۔ اس کے بعد برصغیر ہند میں جو دینی مدارس قائم ہوئے وہ تقریباً سب کے سب براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسی ابتدائی تحریک مدارس کے اثرات کا نتیجہ تھے۔

علم بلاشبہہ کسی انسان کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ علم معمولی انسان کو غیر معمولی انسان بناتا ہے۔ علم ہر قسم کی انسانی ترقی کا واحد یقینی ذریعہ ہے۔ مسند احمد (۳/۴۱۲) اور حدیث کی دوسری کتابوں میں ایک روایت آئی ہے جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما نحل والد ولده أفضل من أدب حسن۔ (الترمذی، کتاب البر) یعنی کسی والد نے اپنی اولاد کو اچھی تعلیم وتربیت سے زیادہ افضل کوئی چیز نہیں دی۔

اس حدیث میں والد اور اولاد کے لفظ کو اگر توسیعی معنی میں لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اولاد سے مراد افراد ملت ہیں اور والد سے مراد ملت کے رہنما۔ یعنی کوئی ملی رہنما اگر اپنی ملت کی بہتر تعلیم وتربیت کا انتظام کرے تو وسیع تر انطباق کے اعتبار سے وہ بھی اس حدیث رسول کا مصداق قرار پائے گا۔

یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اس دور کے علماء نے ملت مسلمہ کو یہی سب سے زیادہ قیمتی تحفہ دیا ہے۔ اللہ کی توفیق سے انھیں یہ موقع ملا کہ وہ علم دین کا ایسا سلسلہ جاری کریں جو نسل در نسل مسلمانوں میں چلتا رہے۔ جو غیر منقطع طور پر مسلم نسلوں کو فائدہ پہنچاتا رہے۔

## چیلنج کا مثبت جواب

پچھلے ڈیڑھ سو سال کے اندر برصغیر ہند میں، اسلام اور ملت اسلام کے حوالہ سے جو تحریکیں اٹھیں، ان میں غالباً سب سے زیادہ دور رس اور نتیجہ خیز تحریک یہی زیر بحث تحریک تھی۔ اس تحریک کو مدارس دینیہ کی تحریک یا تحریک مدارس کہا جاتا ہے۔

مدارس دینیہ کی تحریک کا فکری آغاز متعین کرنا ہو تو غالباً وہ ۱۸۳۴ ہوگا، جیسا کہ معلوم ہے، اسی

سال برطانیہ کا مشہور مدبر لارڈ میکالے(Thomas Babington Macaulay) لندن سے ہندستان آیا۔ اس وقت یہاں برٹش اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ لارڈ میکالے نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ایک تعلیمی اسکیم بنائی۔ اسی اسکیم کی بنیاد پر اس کے بعد ہندستان میں وہ نظام تعلیم جاری ہوا جس کو انگریزی نظام تعلیم کہا جاتا ہے۔ اس تعلیمی نظام کو جس مقصد کے تحت بنایا گیا تھا وہ خود میکالے کے الفاظ میں یہ تھا ــــ تاکہ یہاں ایک ایسی نسل اٹھے جو کہ پیدائش کے اعتبار سے ہندستانی اور فکر کے اعتبار سے انگریز ہو:

So that a generation may arise, which is
Indian in birth and English in thought.

یہ بلاشبہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ مدارس دینیہ کی تحریک اصلاً اسی چیلنج کے جواب کے طور پر ظہور میں آئی۔ علماء کی اس تعلیمی اسکیم کا نشانہ لارڈ میکالے کے مذکورہ بیان کی روشنی میں بتایا جائے تو وہ غالباً یہ ہوگا ــــ تاکہ یہاں ایک ایسی نسل اٹھے جو پیدائش کے اعتبار سے ہندستانی اور اپنے فکر و خیال کے اعتبار سے مسلمان ہو۔

تاریخ بتاتی ہے کہ لارڈ میکالے کا منصوبہ کامیاب نہیں ہوا اور علماء ہند کا منصوبہ اللہ کی توفیق سے کامیاب رہا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج برصغیر ہند میں مسلمان اپنی دینی شناخت کے ساتھ پوری طرح موجود ہیں۔ مغربی تہذیب کا طوفان مسلمانوں کی ملی شناخت کو مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکا، اور یہ زیادہ تر انھیں مدارس کا کارنامہ ہے جن کو علماء نے اپنی قربانیوں سے قائم کیا تھا۔

## ہندستان دار التعلیم ہے

سب سے زیادہ مشکل کام فیصلہ کو بدلنا ہے۔ صحابیٔ رسول خالد بن الولید نے غزوۂ موتہ (۸ھ) کے موقع پر یہی جرأت مندانہ فیصلہ کیا تھا۔ ہندستانی علماء نے انیسویں صدی کے وسط میں اسی عظیم سنت کو دہرایا۔ جیسا کہ معلوم ہے شاہ عبد العزیز دہلوی نے ۱۸۲۳ میں یہ فتویٰ دیا کہ ہندستان دار الحرب ہو چکا ہے۔ اس کی تعمیل میں علماء ہند کی ایک جماعت نے دشمن طاقتوں کے خلاف مسلح جہاد کا آغاز کر دیا۔ مگر تقریباً ۴۰ سال کے تجربہ نے اس کو غیر مفید ثابت کیا۔ اب علماء نے اس معاملہ پر نظر ثانی کی اور ایک اور بلا اعلان "فتویٰ" دیا۔ اپنے معنی کے اعتبار سے یہ دوسرا فتویٰ یہ تھا کہ ــــ ہندستان دار التعلیم ہو چکا ہے۔ اب تمام مسلمانوں کو تعلیم کے میدان میں سرگرم ہو جانا چاہئے۔ یہ نیا فیصلہ اتنا اہم

تھا کہ اس نے متنوع قسم کے مثبت نتائج پیدا کئے۔

## اہل مدارس کی قربانیاں

ہندستان کو "دارالتعلیم" قرار دینے کے بعد' پچھلے ڈیڑھ سو سال کے اندر ملک میں مدارس دینیہ کا جو پھیلاؤ ہوا ہے وہ اپنے آپ نہیں ہو گیا بلکہ وہ ہزاروں علماء کی خاموش قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ ڈیڑھ سو سال پہلے کوئی عالم صرف یہ کر سکتا تھا کہ وہ ایک تعلیمی منصوبہ پیش کرے یا ایک ابتدائی مدرسہ کا قیام عمل میں لائے۔ مگر کوئی بھی ایک عالم اپنی محدود عمر میں یہ نہیں کر سکتا کہ وہ ایک پورے خطۂ ارض میں مدارس کا جال بچھادے اور نسل در نسل ایک پوری امت کو تعلیم یافتہ بناتا رہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ مسلسل ایسے معاون علماء اٹھیں جو اس منصوبہ کو آگے بڑھائیں۔ جو اس کو عملی صورت دینے کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کرتے رہیں۔

پچھلے تقریباً ڈیڑھ سو سال کے اندر ملک کے ہزاروں علماء نے ایثار و قربانی کا یہی عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو آج ہم جانتے ہیں اور بہت سے لوگ وہ ہیں جو وفات پا کر اپنے رب کے پاس چلے گئے اور اب انھیں کوئی نہیں جانتا۔ مگر ان میں سے ہر ایک کی قربانیاں یکساں طور پر عظیم ہیں۔ ان میں سے کسی کا مشہور ہونا اور کسی کا مشہور نہ ہونا صرف ایک اضافی چیز ہے نہ کہ کوئی حقیقی چیز۔

ان علماء کے لئے تعلیم کے اس منصوبہ میں شرکت کوئی سادہ بات نہ تھی۔ یہ گویا ملت کو زندہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو مٹا دینا تھا۔ یہ ایک ایسا منصوبہ تھا جس میں سادہ زندگی گزار کر مر جانا تھا۔ کم آمدنی پر اپنے آپ کو ساری عمر کے لئے راضی کر لینا تھا۔ حتی کہ بعض اوقات کسی مشاہرہ یا معاوضہ کے بغیر ساری عمر ایک ادارہ کی خدمت انجام دینا تھا۔ یہ ایک ایسے کام میں ساری زندگی گزار دینا تھا جس کی بابت پیشگی طور پر معلوم تھا کہ اس میں کوئی دنیوی عزت ملنے والی نہیں۔ مزید یہ کہ یہ ایک ایسا پر خطر کام تھا جس میں اپنے اہل و عیال کے معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر کے قوم کے مستقبل کی تعمیر کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینا تھا۔

ان سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ اس تعلیمی منصوبہ کو عوامی چندہ کے ذریعہ چلانا تھا۔ اور چندہ کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر (وفات ۱۹۳۱) نے درست طور پر کہا تھا کہ چندہ مانگنا اپنے آپ کو دوسروں کی نظر میں بندہ بنانا ہے۔ مدرسہ کو چلانے کے لئے یہ سب سے بڑی قربانی تھی جو علماء کو دینی

پڑی۔ مگر انھوں نے اللہ کی خاطر ان تمام چیزوں کو برداشت کیا اور اس مشکل ترین تعلیمی مہم کو جاری رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہزاروں علماء اگر ایک کے بعد ایک اس تعلیمی مہم کے لئے کھڑے نہ ہوتے اور ہر قسم کی قربانی کے باوجود اس کو مسلسل جاری نہ رکھتے تو یہ منصوبہ صرف ایک نظری منصوبہ بن کر رہ جاتا وہ کبھی تکمیل کے مرحلہ تک نہ پہنچتا۔

یہ علماء قناعت کی بوریوں پر بیٹھ کر ملت کے بچوں کو دین کی تعلیم دیتے تھے، اور معاشرہ کا حال یہ تھا کہ وہ عزت دینے کے بجائے انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کا اندازہ ایک مشہور مسلم شاعر کے ان دو شعروں سے ہوتا ہے:

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا کار طفلاں تمام خواہد شد
گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء اسلام کو کن دل خراش حالات میں اپنا یہ تعلیمی کام انجام دینا پڑا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بر صغیر ہند میں تعلیمی منصوبہ کو مختلف مصلحتوں کی بنا پر فری ایجوکیشن (مفت تعلیم) کے اصول پر چلایا گیا تھا۔ اس اصول نے اہل مدرسہ کے کام کو مزید مشکل بنا دیا۔ مدارس کے ملک گیر اور انتہائی وسیع نظام کو فری ایجوکیشن کے اصول پر چلانا ایک بے حد مشکل منصوبہ تھا۔ جب کہ علماء کا یہ فیصلہ بھی تھا کہ اس کو حکومت کے تعاون کے بغیر آزادانہ طور پر چلانا ہے۔ اس انتہائی مشکل منصوبہ کو علماء اسلام نے اس طرح ممکن بنایا کہ اس کا سارا بوجھ خود اپنے اوپر لے لیا۔ علماء نے توکل اور قناعت اور کفایت شعاری کو اختیار کر کے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ اللہ کے یہ بندے دنیا کے نفع اور نقصان سے بے نیاز ہو کر تعلیم و تدریس کے اس خشک کام میں مصروف رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دور جدید میں فری ایجوکیشن کے اس وسیع منصوبہ کو کامیابی کے ساتھ چلانے کا یہ ایک انوکھا تجربہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال اتنے بڑے پیمانہ پر شاید کسی اور انسانی معاشرہ میں نہیں ملے گی۔

اب اہل مدرسہ کے حالات کافی بدل چکے ہیں۔ ماضی کی قربانیوں کا صلہ اب علماء کے موجودہ گروہ کو یہ مل رہا ہے کہ آج ان کی خدمات کا عام طور پر اعتراف کیا جانے لگا ہے۔ اسی کے ساتھ جدید سہولتوں نے قدیم مشکلات کی جگہ لے لی ہے۔ تاہم اس تبدیلی کے لئے تاریخ کو ڈیڑھ سو سال کا انتظار کرنا پڑا۔

# شریعت کی رہنمائی

اسلامی شریعت کی رہنمائی کا تعلق کچھ محدود مسائل سے نہیں ہے بلکہ اس سے زندگی کے ہر معاملہ میں رہنمائی ملتی ہے۔ مدارس کی تحریک کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کو اس معاملہ میں شریعت کے رہنما اصولوں کی روشنی میں چلایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس کی تحریک کو وہ کامیابی ملی جو موجودہ زمانہ میں کسی دوسری تحریک کو نہیں ملی۔ یہاں اس سلسلہ میں اس کے چند پہلوؤں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

## حدیث رفق

یہ دنیا فطرت کے مقرر قوانین پر چل رہی ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس دنیا میں طاقت کا زیادہ بڑا حصہ عدم تشدد (non-violence) میں ہے۔ اس کے مقابلہ میں تشدد (violence) اکثر تخریب کاری پر منتج ہوتا ہے۔ خدا کی اس دنیا میں طاقت کا زیادہ بڑا سرچشمہ امن ہے نہ کہ جنگ۔ اس حقیقت کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: **إن الله يعطي على الرفق مالا يعطي على العنف** (صحیح مسلم، کتاب البر)۔ یعنی اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جس کو وہ سختی پر نہیں دیتا۔

اس حدیث کا تعلق صرف اخلاقی سلوک سے نہیں بلکہ اس کا تعلق ہر قسم کے عمل سے ہے، حتی کہ اجتماعی زندگی کی بڑی بڑی سرگرمیوں سے بھی۔ اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی نتیجہ خیز عمل گہری منصوبہ بندی چاہتا ہے۔ اس دنیا میں ہر عمل کے راستہ میں بے شمار رکاوٹیں ہیں۔ قدم قدم پر دوسروں کے ساتھ ٹکراؤ کا امکان پیش آتا ہے۔ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے۔

اگر آپ یہ چاہیں کہ پہلے تمام رکاوٹوں کو راستہ سے ہٹا دیا جائے تاکہ آپ کا سفر بلا روک ٹوک تیزی کے ساتھ جاری ہو سکے، تو ایسی حالت میں یہ ہوگا کہ آپ کا سفر ہی کبھی شروع نہ ہو سکے گا۔ اس قسم کا ذہن کبھی نہ ختم ہونے والا تشدد شروع کر دے گا۔ ایک کے بعد ایک آپ مختلف رکاوٹوں سے لڑتے رہیں گے۔ آپ کی یہ متشددانہ جدوجہد کبھی ختم نہ ہوگی۔ کیوں کہ اللہ نے اس دنیا میں انسان کو مختلف قسم کی رکاوٹوں اور مشکلات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ (البلد ۴) اللہ کی مشیت یہی ہے کہ یہ دنیا کبھی ان رکاوٹوں سے خالی نہ ہو۔ ایسی حالت میں اس دنیا میں ٹکراؤ کا

طریقہ صرف ایک بے نتیجہ عمل کا نام ہے، وہ کسی نتیجہ خیز عمل کا نام نہیں۔

پھر اس دنیا میں عمل کا طریقہ کیا ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ رکاوٹوں کو نظر انداز کیا جائے اور پرامن عمل کے ذریعہ مواقع کو استعمال کیا جائے۔ قرآن کی شہادت کے مطابق، اس دنیا میں عسر کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ہمیشہ یسر موجود رہتا ہے۔ (الانشراح ۵)

قرآن کی اس آیت میں عسر سے مراد مسائل (problems) ہیں، اور یسر سے مراد مواقع (opportunities) ہیں۔ قانون فطرت کے مطابق، یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے (مع العسر یو جد الیسر، ابن کثیر)۔ ایسی حالت میں عمل کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ مسائل و مشکلات کو نظر انداز کیا جائے اور جو مواقع موجود ہیں ان کو غیر نزاعی انداز میں استعمال کیا جائے۔

مدارس دینیہ کی تحریک اسی حکیمانہ اصول کی ایک عملی مثال ہے۔ انیسویں صدی میں جو علماء اس تحریک کو لے کر اٹھے ان کی ایک سوچ یہ ہو سکتی تھی کہ پہلے موجودہ عسر کو ختم کرو۔ یعنی برطانی حکمرانوں کو ہلاک کرو۔ انگریزی نظام تعلیم کے ڈھانچہ کو تباہ کرو، وغیرہ۔ اس کے بعد ہی ہمارے لئے وہ وقت آسکتا ہے جب کہ ہم اپنی پسند کا تعلیمی نظام اس ملک میں قائم کریں۔

اگر ہمارے علماء کی یہ سوچ ہوتی تو ان کی یہ تحریک شروع ہو کر چند سال کے بعد ہی ختم ہو جاتی۔ اس کا کوئی مثبت نتیجہ ملت مسلمہ کو نہ ملتا، جیسا کہ اس قسم کی بہت سی متشددانہ تحریکوں کا کوئی مثبت فائدہ نہیں ملا۔ مگر علماء کو اللہ تعالیٰ نے یہ بصیرت (vision) دی کہ وہ دونوں طریقوں کے فرق کو سمجھیں۔ چنانچہ انھوں نے تخریب غیر کے بے فائدہ کام کو چھوڑ کر تعمیر خویش کے مفید میدان میں اپنی ساری طاقت لگادی۔ اس کا نتیجہ اتنا کامیاب نکلا کہ یہ تحریک مذکورہ حدیث کی ایک عملی مثال بن گئی۔

## حدیث مداومت

عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہمیشہ رہنے والا عمل، اگرچہ وہ کم ہو۔ اور آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اپنے آپ کو ایسے عمل کا پابند بناؤ جس کی تم طاقت رکھتے ہو:

عن عائشة رضی الله عنها أنها قالت: سئل النبی صلی الله علیه وسلم: أی

الاعمال أحب الیٰ اللہ؟ قال : أدومها وإن قل. وقال: اكلفوا من الاعمال ما تطيقون. (صحيح البخاری، كتاب الرقاق، باب القصد و المداومة على العمل)

اس حدیث کا انطباق عام طور پر اذکار اور عبادات جیسے اعمال پر کیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں ایک عام اصولِ حیات بتایا ہے۔ اس کا ایک جزء بلاشبہ ذکر و عبادت ہے، مگر زندگی کے بقیہ شعبوں سے بھی اس کا تعلق اتنا ہی ہے جتنا کہ ذکر و عبادات سے۔

ایسا عمل جو قابل مداومت ہو، وہ اللہ کو زیادہ پسند ہے، یہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کسی بھی عمل کا کوئی بڑا اور گہرا نتیجہ صرف اس وقت نکلتا ہے جب کہ اس کو لمبی مدت تک جاری رکھا جائے۔ نتیجہ اور لمبا عمل دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ چونکہ اللہ کے نزدیک قدر افزائی کے قابل کام صرف وہی ہے جو نتیجہ خیز ہو۔ وقتی قسم کی بے نتیجہ ہنگامہ آرائی اللہ کو پسند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے نزدیک وہی عمل قابل قدر ہے جس میں مداومت کی صفت پائی جائے۔ علماء کی تحریک تعلیم ایک مثبت اور غیر متشددانہ تحریک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں مداومت کی صفت پیدا ہو گئی۔ وہ اپنی اس صفت کی بنا پر اللہ کی پسندیدہ تحریک قرار پائی۔ اور نتیجۃً بہت سے فوائد کا سبب بنی۔

علماء نے تحریک مدارس کی صورت میں جو کام کیا اس کی خاص صفت یہ تھی کہ یہ کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسا کام تھا جو شروع ہونے کے بعد مسلسل جاری رہ سکے۔ چنانچہ وہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے برصغیر ہند میں جاری ہے اور دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ اس مدت میں یہ کام نہ صرف برصغیر ہند میں پھیلا ہے بلکہ اس نظام کے تربیت پائے ہوئے افراد باہر کے ملکوں میں بھی جا کر کثیر تعداد میں چھوٹے اور بڑے مدارس قائم کر چکے ہیں۔ ان کی نہ صرف تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ نوعیت کے اعتبار سے بھی ان میں مختلف قسم کی ترقیاں وقوع میں آئی ہیں۔ مثلاً لڑکوں کے مدرسہ کے علاوہ لڑکیوں کے بڑے بڑے مدرسہ کا قائم ہونا، مدرسوں کا ماڈرنائز کیا جانا، مدرسوں میں کمپیوٹر اور دوسری نئی چیزوں کا اضافہ۔ مدرسوں میں مختلف علمی شعبوں کا اضافہ، مثلاً دارالافتاء، تصنیف و تالیف، دعوت و تبلیغ اور صحافت، وغیرہ۔

ان علماء کے کام کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ایک ایسی صحت مند روایت (healthy tradition) کو

قائم کرنے کا سبب بنے جو ان کے بعد مسلسل جاری رہی اور بے شمار لوگ اس روایت کو لے کر آگے بڑھتے رہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا درست ہوگا کہ ان علماء کی جاری کردہ تحریک مدارس اس ارشاد رسول کی مصداق ہے: لا یسن عبد سنۃً صالحۃ یعمل بھا بعدہ الا کتب لہ مثل اجر من عمل بھا ولا ینقص من اجورھم شیٔ (صحیح مسلم، کتاب العلم، صفحہ ۲۲۶)۔ یعنی جب بھی کوئی بندہ ایک صالح سنت کو جاری کرتا ہے جس پر اس کے بعد عمل کیا جائے تو اس کے لئے بھی اتنا ہی ثواب لکھ دیا جاتا ہے جتنا اس کے بعد عمل کرنے والوں کے لئے، اور عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ اس حدیث میں صالح سنت سے مراد صحت مند روایت (healthy tradition) ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان علماء کی جاری کردہ تحریک مدارس اسی قسم کی ایک صالح سنت تھی۔ اس لئے جن لوگوں نے اب تک اس روایت پر عمل کیا یا آئندہ جو لوگ اس پر عمل کریں گے ان سب کے اجر و ثواب کے بقدر اجر و ثواب اس کے ابتدائی معماروں کو بھی ملتا رہے گا، بغیر اس کے کہ بعد کو عمل کرنے والوں کے اجر و ثواب میں کوئی کمی کی گئی ہو۔

## پر امن میدان عمل

انیسویں صدی عیسوی میں جب مغربی استعمار کا مسئلہ نمایاں طور پر سامنے آیا تو اس کے خلاف مسلم رہنماؤں کا پہلا ردعمل تشدد انہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے انگریزوں کے خلاف مسلح جہاد (۱۸۵۷) کیا۔ مگر یہ جہاد اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس تجربہ کے بعد انھوں نے اپنے طریقہ کار کو بدل دیا۔ یہ مسلح جہاد حکماً اگرچہ ایک اسلامی فعل تھا، مگر اجتماعی معاملات میں کسی اقدام کے بارے میں صرف یہ دیکھنا کافی نہیں کہ حکماً وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ دیکھنا بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ عملی طور پر نتیجہ خیز ہے یا نہیں۔ ایک طریق کار، تجربہ کے بعد نتیجہ خیز ثابت نہ ہو تو عقل و شریعت کا تقاضا ہے کہ طریق کار کو بدل دیا جائے۔

مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے سرداران قریش سے بدر (۲ھ) کے مقام پر مسلح مقابلہ کیا۔ مگر اس کے بعد انہی سرداران قریش سے حدیبیہ (۶ھ) کے مقام پر آپ نے صلح کر لی۔ اسی طرح غزوۂ احد (۳ھ) کے موقع پر آپ نے مدینہ سے تین میل باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کیا، مگر

اس کے بعد انہیں حملہ آوروں سے غزوۂ احزاب (۵ھ) کے موقع پر مدینہ کے اندر رہتے ہوئے دفاع کا انداز اختیار کیا، وغیرہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح صالح مقصد کے لئے اقدام کرنا ایک پیغمبرانہ سنت ہے اسی طرح دفاعی تدبیر کو بدلنا بھی ایک پیغمبرانہ سنت ہے۔ دونوں کام یکساں طور پر اسلامی ہیں اور سنت رسول بھی۔ ہندستان کے علماء نے اسی معلوم سنت پر عمل کیا چنانچہ انھوں نے مسلح جہاد کو غیر موثر دیکھ کر اپنے میدان کار کو بدل دیا۔ اور تعلیم کو اپنا میدان عمل بنالیا۔ گویا کہ مدرسہ ملی جدوجہد کو تشدد کے میدان سے نکال کر امن کے میدان میں لانے کا عنوان ہے۔

اس اعتبار سے یہ گویا پر تشدد عمل کے مقابلہ میں پر امن عمل کا انتخاب (choice) لینا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان مسلم رہنماؤں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تشدد کے میدان میں اپنی کوششیں صرف کرنے کے بجائے امن کے میدان میں وہ زیادہ مفید طور پر اپنی کوششوں کا استعمال کریں۔

عجیب بات ہے کہ ۱۹ویں صدی کے نصف آخر میں تقریباً ایک ساتھ دو مختلف تعلیمی تحریکیں اٹھیں۔ ایک طرف سر سید احمد خاں کی تحریک تھی جو عام طور پر علیگڈھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک کے ایک رکن مولانا الطاف حسین حالی (وفات ۱۹۱۴) نے اس کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا:

بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے تعلیم ہی ہے

دوسری طرف مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے ہم عصر علماء تھے۔ مولانا نانوتوی سر سید احمد خاں کے ہم سبق تھے، دونوں دلی کالج میں ایک ساتھ مولانا مملوک علی کے شاگرد رہ چکے تھے۔ دونوں کا نشانہ بیک وقت تعلیم تھا۔ فرق یہ ہے کہ سر سید احمد خاں نے انگریزی زبان اور سیکولر علوم کو اپنی تعلیمی تحریک کا مرکز بنایا۔ اس کے مقابلہ میں مولانا نانوتوی اور ان کے ہم عصر علماء کا نشانہ یہ تھا کہ ملت مسلمہ کے درمیان عربی زبان اور دینی علوم کی اشاعت کی جائے۔

سر سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک گویا وقت کا تقاضا تھی اور علماء کی تحریک گویا دین کا تقاضا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر اٹھنے والی تحریکوں میں یہی دونوں تحریکیں ہیں جو مثبت معنوں میں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ اس کا سبب بلاشبہہ یہی تھا کہ ان دونوں تحریکوں کو پر امن

جدوجہد کے اصول پر چلایا گیا۔ علماء اسلام کی طرف سے شروع کی جانے والی مدارس دینیہ کی تحریک وقت کی ایک ضرورت تھی۔ وہ اپنے اندر بھرپور امکانات رکھتی تھی۔ چنانچہ وہ شروع ہونے کے بعد پھیلتی رہی، یہاں تک، کہ اب وہ اس توسیعی مرحلہ تک پہنچ چکی ہے کہ ہر جگہ اس کے مظاہر دیکھے جاسکتے ہیں۔

## علماء کا قائدانہ کردار

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کے مخاطب اول ہمیشہ ملاء قوم (الاعراف ۸۸) ہوتے تھے۔ یعنی وقت کے سردار۔ وقت کے سرداروں کو اپنا مخاطب بنانے کے لئے پہلی اور لازمی شرط یہ ہے کہ داعی اور مدعو کی زبان ایک ہو۔ اگر داعی اور مدعو کے درمیان لسانی بعد (language gap) ہو تو ایسے تخاطب کا وجود میں آنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر بھیجے سب لسانِ قوم (ابراہیم ۴) میں بھیجے، یعنی پیغمبروں کی زبان بھی وہی تھی جو قوم کے اعلیٰ افراد کی زبان تھی۔

علماء پیغمبروں کے وارث ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام کے ظہور کے بعد علماء تقریباً ایک ہزار سال تک یہ کام بخوبی طور پر انجام دیتے رہے۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ پچھلے زمانوں میں علماء کی زبان بھی وہی ہوتی تھی جو وقت کے سربرآوردہ طبقہ کی ہوتی تھی۔ دمشق اور بغداد اور قاہرہ اور قرطبہ وغیرہ میں جو نظام اقتدار قائم ہوا ان میں ہمیشہ علماء اپنا قائدانہ رول ادا کرتے رہے۔ اس کا بنیادی سبب بلاشبہہ یہی تھا کہ اس زمانہ میں سربرآوردہ طبقہ کی زبان عربی تھی اور علماء اسلام کی زبان بھی عربی تھی۔ اس طرح دونوں طبقوں کے درمیان کوئی لسانی بعد نہیں پایا جاتا تھا۔

برطانوی اقتدار سے پہلے کے ہندستان میں بھی یہ صورت حال باقی رہی۔ اس زمانہ کے مسلم ارباب اقتدار عام طور پر فارسی زبان بولتے یا سمجھتے تھے، اور علماء اسلام کی زبان بھی اس زمانہ میں فارسی تھی۔ اس بنا پر علماء کے لئے ممکن ہو گیا کہ وہ وقت کے سربرآوردہ طبقہ کو براہ راست مخاطب کر سکیں اور اپنے قائدانہ رول کو کامیابی کے ساتھ ادا کرتے رہیں۔ مثال کے طور پر شیخ احمد سرہندی نے اپنے وقت کے امراء حکومت کو مخاطب کرنا چاہا تو انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ کیوں کہ دونوں کی زبان یکساں طور پر فارسی تھی۔

مگر ہندستان میں برطانوی اقتدار قائم ہونے کے بعد صورت حال بدل گئی۔ اب یہاں کے حاکموں اور لیڈروں اور تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان انگریزی بن گئی۔ اب نہ صرف حکام سے ربط کے لئے بلکہ عوامی سطح پر کوئی بڑی تحریک چلانے کے لئے بھی انگریزی زبان لازمی طور پر ضروری ہو گئی۔ اس لسانی تبدیلی کے بعد ملکی تاریخ دوسرا منظر دیکھتی ہے۔ علماء اسلام جو تقریباً ہزار سال سے ملی اور سیاسی معاملات میں قائدانہ رول ادا کرتے چلے آرہے تھے، انہوں نے اچانک اپنے آپ کو اس میدان میں حاشیہ پر پایا۔

مثال کے طور پر بیسویں صدی کے نصف اول میں برصغیر ہند میں دو بڑی تحریکیں اٹھیں ـــــ آزادیٔ ہند کی تحریک اور تقسیم ہند کی تحریک۔ علماء نے ان دونوں تحریکوں میں حصہ لیا۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ دونوں تحریکوں میں ان کا رول زیادہ تر ثانوی رہا۔ دونوں ہی میں قائدانہ رول وہ غیر علماء ادا کرتے رہے جو انگریزی زبان میں لکھنے اور بولنے کی قدرت رکھتے تھے۔

تقسیم کے بعد بھی کم و بیش یہی صورت حال باقی رہی۔ مثال کے طور پر تقسیم کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے درمیان اٹھنے والی سب سے بڑی تحریک وہ تھی جو آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک میں علماء بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ مگر دھیرے دھیرے دوبارہ یہی ہوا کہ علماء اس کے نظام میں غیر مؤثر ہو گئے اور غیر علماء، مثلاً ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی اور ڈاکٹر سید محمود وغیرہ، عملاً اس کے اوپر چھا گئے، اس کا نتیجہ علماء اور غیر علماء کے درمیان کشاکش کی صورت میں نکلا۔ جس کا آخری انجام یہ ہوا کہ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اپنا نشانہ پورا کرنے سے پہلے ہی اختلاف و انتشار کا شکار ہو کر رہ گئی۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندستانی علماء بالقوۃ طور پر اپنے اندر وہ تمام صلاحیتیں رکھتے ہیں جو آج کے حالات میں قیادتی کردار ادا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ مگر صرف ایک کمی نے ان کو قیادت کے میدان سے باہر کر دیا ہے، اور وہ ہے انگریزی زبان یا بالفاظ دیگر عصری زبان میں لکھنے اور بولنے پر قادر نہ ہونا۔ اب آخری طور پر علماء کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ انگریزی زبان کو خصوصی اہتمام کے ساتھ سیکھیں۔ بصورت دیگر، انہیں آج کی دنیا میں تقدس کا درجہ تو مل سکتا ہے مگر انہیں قیادت کا درجہ

ملنا ممکن نہیں۔اور یہ خود فطرت کے قانون کی بنا پر ہوگا نہ کہ کسی کی سازش کی بنا پر۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ مدارس کے نصاب میں انگریزی زبان لازمی مضمون کے طور پر داخل نصاب ہو۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہر بڑے مدرسہ میں انگریزی زبان اور عصری علوم کو اختیاری مضمون(optional subject) کی حیثیت سے شامل کیا جائے۔اور طلبہ کے لئے یہ موقع ہو کہ ان میں سے جو شخص چاہے وہ اس سے استفادہ کر سکے۔یہی واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم مدارس کو یا علماء کو دوبارہ اس قابل بنا سکتے ہیں کہ آج کے حالات میں وہ اپنا قائدانہ رول ادا کر سکیں۔

بین اقوامی کانفرنسوں میں شرکت کے دوران مجھے بار بار یہ تجربہ ہوا ہے کہ دوسرے مذاہب میں ایسے افراد کثرت سے موجود ہیں جو عالمی اسٹیج پر اپنے مذہب کی نمائندگی انگریزی زبان اور عصری اسلوب میں کر سکیں۔ مگر اسلام کی صفوں میں ایسے علماء مشکل سے ملیں گے جو حقیقی طور پر اس کام کے اہل ہوں اور ان مواقع کو استعمال کرتے ہوئے وقت کے معیار پر اسلام کی نمائندگی کر سکیں۔ دینی مدارس کی یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ اس نقصان کی تلافی کے لئے ضروری تدابیر اختیار کریں۔

اس سلسلہ کی چند مزید صورتیں یہ ہو سکتی ہیں۔ جدید متعلق موضوعات پر توسیعی لکچر (Extention Lecture) کا انتظام کرنا۔ مقرر نصاب کے ساتھ مزید کتابیں تجویز(recommend) کرنا۔ طلبہ کو بین مذاہب اجتماعات میں شرکت کے مواقع دینا۔ تعطیلات میں طلبہ کے تربیتی کیمپ قائم کرنا۔ طلبہ کی انجمن کے تحت جدید موضوعات پر تقریر و مذاکرہ کا پروگرام رکھنا، وغیرہ۔

## مدارس کا دعوتی پہلو

اسلامی درس گاہ کا تصور جو قرآن میں دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ایسے لوگ تیار ہوں جو درس گاہ سے فارغ ہو کر اقوام عالم میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا کام (التوبہ ۱۲۲) انجام دیں۔اسلام کے ظہور کے بعد مسلسل یہ کام جاری رہا۔ ہر دور میں جو دینی مدارس قائم کئے گئے ان کا خاص مقصد یہی تھا کہ ان کے نظام کے تحت ایسے علماء تیار ہوں جو مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے ساتھ اسلام کی عمومی اشاعت کا فریضہ بھی انجام دے سکیں۔ مدارس کا یہ نظام کم و بیش آج بھی جاری ہے۔ مگر بعد کے اسباب کے تحت مدارس کا یہ شعبہ دعوتی اسلوب کے بجائے مناظرہ کے اسلوب پر قائم ہو گیا۔

یہی وجہ ہے کہ یہ مدارس حقیقی اسلامی تبلیغ کے میدان میں عملاً غیر موثر ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے مدارس سے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں علماء تیار ہو کر نکل رہے ہیں مگر وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ اسلام کی دعوتی ضرورت کو پورا کر سکیں۔

اس کا سبب زمانی حالات کا فرق ہے۔ ہمارے مدارس میں بظاہر آج بھی طلبہ کو نصابی یا غیر نصابی ذرائع سے دعوت و تبلیغ کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ مگر یہ تیاری تمام تر مناظرہ کے اصول پر ہوتی ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں دعوت کے اصول پر۔ مدارس کے طلبہ علم مناظرہ تو پڑھتے ہیں مگر وہ علم دعوت سے آشنا نہیں ہوتے۔ وہ اچھے مناظر تو ہوتے ہیں مگر وہ اچھے داعی نہیں ہوتے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ہمارے مدارس کے فارغین کو عملاً دعوت و تبلیغ کے لئے غیر موزوں بنا دیا ہے۔

قدیم زمانہ مناظرہ (debate) کا زمانہ تھا۔ مناظرہ کا یہ طریقہ قدیم "دور شمشیر" کے زیر اثر پیدا ہوا۔ شمشیر کا عمل ہار جیت کے اصول پر قائم تھا۔ اس کا اصول یہ تھا کہ میدان جنگ میں جو شخص جیتے وہ کامیاب، اور جو شخص ہارے وہ ناکام۔ اسی مخصوص فضا کے تحت مناظرہ کا فن پیدا ہوا جو خود بھی جیت اور ہار کے اصول پر مبنی تھا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ میدان جنگ میں تلوار جیت اور ہار کا فیصلہ کرتی تھی اور میدان مناظرہ میں الفاظ سے جیت اور ہار کا یہ کام لیا جاتا تھا۔

اس قسم کا مناظرہ قدیم دور کے حالات میں بہت مقبول ہوا۔ ہر طرف اس کی دھوم ہونے لگی، مگر موجودہ زمانہ میں یہ رجحان مکمل طور پر بدل چکا ہے۔ موجودہ زمانہ سائنسی تجزیہ کا زمانہ ہے نہ کہ لفظی جدال کا زمانہ۔ چنانچہ پہلے جہاں مناظرہ کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، اب وہاں سنجیدہ ڈائیلاگ (serious dialogue) کی مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں۔

یہ زمانی تبدیلی تقاضا کرتی ہے کہ مدارس کے نظام تعلیم کو اس سے ہم آہنگ کیا جائے۔ طلبہ کو مناظرہ اور مجادلہ کے بجائے علمی ڈسکشن (scientific discussion) کے لئے تیار کیا جائے۔

مناظرہ اور ڈائیلاگ میں کیا فرق ہے، وہ فرق بنیادی طور پر یہ ہے کہ مناظر پیشگی طور پر فریق ثانی کو اپنا حریف سمجھتا ہے۔ مناظر کے دل میں فریق ثانی کے لئے خیر خواہی کا جذبہ نہیں ہوتا۔ وہ فریق ثانی کی اصلاح سے زیادہ اس کی شکست سے دلچسپی رکھتا ہے۔ مناظر کے اس ذہن کی بنا پر مناظرہ کا

پورا عمل ایک قسم کی لفظی کشتی بن جاتا ہے۔ مناظر کی زبان آرا کی طرح تیز ہو جاتی ہے نہ کہ پھول کی طرح نرم۔ یہاں تک کہ یہ نوبت آجاتی ہے کہ مناظر کو اس سے دلچسپی نہیں رہتی کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ اس کی ساری دلچسپی اس سے ہوتی ہے کہ ایک ماہر وکیل کی مانند کسی نہ کسی طرح وہ فریق ثانی کو میدان مقابلہ میں ہرا دے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہونے والے مناظروں کی رودادیں پڑھ کر اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مناظرہ اور دعوت کے فرق کو قرآن کی زبان میں بیان کرنا ہو تو وہ ایک لفظ میں یہ ہوگا کہ دعوت کا نشانہ آدمی کا قلب ہوتا ہے۔ داعی ایسی بات کہنے کی کوشش کرتا ہے جو فریق ثانی کے دل میں اتر جانے والی ہو (النساء ۲۳)۔ اس کے برعکس مناظر کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح فریق ثانی کو مقابلہ کے میدان میں پچھاڑ دے۔ مگر مناظرہ کا یہ طریقہ پیغمبروں کی سنت کے مطابق نہیں۔

یہ ایک لازمی ضرورت ہے کہ اس معاملہ میں مدارس کے نظام کو بدلا جائے۔ اس کو مناظرہ کے بجائے دعوت کے قرآنی اصول پر قائم کیا جائے۔

# علم کا چشمۂ رواں

اسلام کے آغاز ہی سے تعلیم یا پڑھنا اور پڑھانا مسلم معاشرہ کا ایک لازمی حصہ بن گیا اور پھر وہ کبھی اس سے جدا نہ ہوا۔ علم کے اس چشمۂ رواں کے دو بڑے دھارے تھے۔ ایک اجتماعی ادارہ (institution) اور دوسرے انفرادی تلمذ (discipleship)۔ علم کے یہ دونوں دھارے اس کے دور اول سے ہی اسلام کی تاریخ کا مستقل حصہ بن گئے۔ دور اول میں قائم ہونے والا پہلا تعلیمی ادارہ وہ تھا جو صفہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مدرسۂ صفہ کے معلم اول خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور اس کے جو طلبہ تھے ان کو اصحاب صفہ کہا جاتا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ اسی مدرسۂ صفہ کے ایک طالب علم تھے جو احادیث رسول کا سب سے بڑا ماخذ ہیں۔ مدرسۂ صفہ گویا ایک تعلیمی بیج تھا۔ وہ بڑھتے بڑھتے آخر کار ایک تناور درخت بن گیا۔ اس کی شاخیں اور پتیاں تقریباً تمام آباد دنیا میں پھیل گئیں۔

اس تعلیمی چشمہ کا دوسرا زیادہ بڑا دھارا وہ ہے جو انفرادی تلمذ (discipleship) کی صورت میں جاری ہوا۔ ہر صاحب علم اس عظیم تعلیمی قافلہ کا ایک ممبر تھا۔ اس سلسلہ کی پہلی مثال اصحاب رسول کے یہاں ملتی ہے۔ تقریباً تمام اکابر صحابہ کا حال یہ تھا کہ وہ روزانہ لوگوں کے لئے حصول علم کا مرکز بنے رہتے تھے۔ یہ تعلیم انفرادی تلمذ کے اصول پر جاری تھی۔

اس کے بعد انفرادی معلمی کا یہ سلسلہ نسل در نسل جاری ہو گیا۔ صحابہ کے ذریعہ تابعین نے کسب فیض کیا۔ تابعین اس کے بعد تبع تابعین کے معلم بنے رہے۔ یہی تمام علمی گروہوں کا حال ہوا۔ محدثین اور فقہاء، مفسرین اور شارحین، متکلمین اور مورخین اسلام، ائمہ اور علماء اسلام، صلحاء اور صوفیہ کی بیشتر تعداد اسی طرح انفرادی تلمذ اور شخصی کسب فیض کے ذریعہ علم دین حاصل کرتی رہی۔ تاریخ اسلام کے اکثر بڑے بڑے علماء انہی انفرادی درس گاہوں میں تعلیم پاکر تیار ہوئے۔ حتی کہ مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی جیسے علماء متاخرین بھی اسی انفرادی تعلیمی نظام میں بن کر تیار ہوئے۔

مغربی کلچر دراصل مرچنٹ کلچر تھا جس نے ہر چیز بشمول تعلیم کو کمرشلائز کر دیا۔ اس کے نتیجہ

میں ساری اہمیت ملازمت رخی تعلیم (job oriented education) کی ہو گئی۔ تعلیم کو ملازمت (job) سے مربوط کر دیا گیا۔ اب سرٹیفکٹ دینے والے اسکول اور کالج کا رواج بڑھنے لگا یہاں تک کہ اب یہ حال ہے کہ سیکولر تعلیم کے دائرہ میں انفرادی تلمذ کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ کیوں کہ مطلوب ڈگری منظور شدہ تعلیمی اداروں کے ذریعہ ملتی ہے نہ کہ انفرادی علمی صحبتوں کے ذریعہ۔ اس تبدیلی کا فطری اثر وقت کے دینی نظام تعلیم پر بھی پڑا۔

یہ تعلیمی سلسلہ جس کو میں نے علم کے چشمۂ رواں کے دو دھارے قرار دیا ہے وہ میرے لئے صرف ایک تاریخی خبر کی چیز نہیں بلکہ وہ میرا ذاتی تجربہ بھی ہے۔ اللہ کے فضل سے مجھے یہ موقع ملا کہ میں علم کے ان دونوں دھاروں سے کسب فیض کروں اور بھرپور طور پر ان سے سیراب ہوں۔

یہاں میں اس سلسلہ میں اپنے ان بعض تجربات کا ذکر کروں گا جن میں عمومی سبق موجود ہے۔

میں غالباً ۱۹۳۰ میں اپنے گاؤں کے مدرسہ میں داخل کیا گیا۔ یہاں میں نے الف ب سے اپنی تعلیم شروع کی۔ گاؤں کے اس مدرسہ میں میرے استاد مولانا فیض الرحمٰن اصلاحی مرحوم تھے جو مدرسۃ الاصلاح کے بانی مولانا محمد شفیع صاحب مرحوم کے فرزند تھے۔ مولانا فیض الرحمٰن اصلاحی جو ایک ذی استعداد عالم تھے، وہ نہ صرف میرے مدرسی استاد تھے بلکہ وہ میرے خصوصی معلم بھی تھے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ گاؤں کے اس مدرسہ میں شاید میں پہلا طالب علم تھا جس نے وہاں ابتدائی فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ جب کہ دوسرے طلباء زیادہ تر اردو اور ناظرہ قرآن تک پڑھائی پر اکتفا کرتے تھے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے اپنے زمانۂ تشکیل (formative period) میں مولانا فیض الرحمٰن اصلاحی جیسا مخلص عالم ملا جس نے ابتدائی عمر ہی میں میرے اندر تحصیل علم کا شوق پیدا کر دیا جو پھر کبھی ختم نہ ہو سکا۔

مدرسہ کی رسمی تعلیم کے علاوہ میرا گھر بھی میرے لئے مستقل طور پر ایک غیر رسمی درس گاہ بنا رہا۔ میرے والد فرید الدین خاں مرحوم کے انتقال (۱۹۲۹) کے بعد میرے عم زاد برادر بزرگ مولانا اقبال احمد خاں سہیل ایڈوکیٹ، ایم اے، ایل ایل بی گویا میرے سرپرست تھے۔ وہ نہایت ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ وہ گہری علمی دستگاہ رکھتے تھے۔ انہوں نے وقت کے اساتذہ سے فارسی اور عربی کی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھی تھیں، مثلاً مولانا محمد شفیع صاحب (بانی مدرسۃ الاصلاح)، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حمید الدین فراہی وغیرہ۔

بعد کو انہوں نے علی گڑھ میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم اے ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ اور اعظم گڈھ میں وکالت کرنے لگے۔ اس کے بعد وہ 'مسٹر' ہو گئے اور 'صاحب' کہے جانے لگے۔ تاہم جہاں تک ان کے ساتھ میرے علمی استفادہ کا تعلق ہے وہ آخر عمر تک جاری رہا۔ مولانا اقبال احمد سہیل مرحوم کے ساتھ میرا یہ تعلیمی استفادہ اس قدیم دور کی یاد دلاتا ہے جب کہ ہر صاحب علم اپنی ذات میں ایک درس گاہ ہوتا تھا۔ زمانۂ قدیم کے اکثر علماء اسی قسم کی انفرادی درس گاہوں میں تعلیم پاکر علم کے بڑے مرتبہ تک پہنچے۔

میرے بزرگ چچا صوفی عبدالمجید خاں صاحب کو یہ شوق تھا کہ خاندان میں ایک ایسا شخص ہو جو مدرسہ کی تعلیم و تربیت حاصل کرے اور وہ باقاعدہ عالم ہو۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۸ میں اپنے صرف پر ایک متطلع طالب علم کی حیثیت سے میرا داخلہ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڈھ) میں کرایا اور اپنی ذاتی نگرانی میں میری تعلیم کی تکمیل کرائی۔ مدرسی انداز پر میری رسمی تعلیم اسی ادارہ میں ہوئی۔ مدرسۃ الاصلاح کی باقاعدہ تعلیم کے دوران جن اساتذہ سے مجھے علمی استفادہ کا موقع ملا، ان میں سے کچھ کا ذکر اس کتاب کے دوسرے صفحات میں موجود ہے۔

مدرسۃ الاصلاح کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد میرے اوپر ایک لمبا دور ایسا گزرا ہے جب کہ میں کتب خانوں میں گم رہا۔ مثلاً دار المصنفین اعظم گڈھ کا کتب خانہ اور اسی طرح دوسرے بہت سے کتب خانے اور لائبریریاں۔ اس دوران میں نے قرآن و حدیث اور سیرت اور دوسرے اسلامی علوم کو از سر نو زیادہ تفصیل کے ساتھ پڑھا۔ اعظم گڈھ کے زمانۂ قیام میں اسی کے ساتھ مختلف علماء سے انفرادی کسب فیض کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔ مثلاً شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا اقبال احمد سہیل وغیرہ (ملاحظہ ہو "مولانا سہیل" مطبوعہ مضامین رشید، از پروفیسر رشید احمد صدیقی)

میں ۱۹۵۶ میں جماعت اسلامی ہند کے مرکزی شعبۂ تصنیف سے وابستہ ہوا۔ اس وقت جماعت اسلامی ہند کا مرکزی دفتر اور اس کا شعبۂ تصنیف و تالیف دونوں رام پور (یوپی) میں تھے۔ یہاں کے زمانہ قیام میں مولانا جلیل احسن ندوی (وفات ۱۹۸۱) میرے عربی کے استاد بنے رہے۔ مولانا مرحوم کو ادب عربی پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ ان سے میرا تعلیمی استفادہ مسلسل جاری رہا۔ اس زمانہ میں رام پور میں ایک جید عالم مولانا عبدالوہاب صاحب رہتے تھے۔ ان سے بھی مجھے بار بار علمی استفادہ کا موقع ملا۔

رامپور کے زمانہ قیام میں مولانا صدرالدین اصلاحی (وفات ۱۹۹۸) سے بھی مجھے مسلسل علمی استفادہ کا موقع ملا۔

۱۹۶۳ میں میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (لکھنؤ) سے وابستہ ہوا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اقامت اختیار کی۔ اس سلسلہ میں کئی سال تک میرا قیام دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کیمپس میں رہا۔ اس قیام کے زمانہ میں مسلسل میں وہاں کے سینئر اساتذہ سے استفادہ کرتا رہا۔ مثلاً مولانا محمد اسحاق سندیلوی، مولانا محمد اویس نگرامی، مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، مولانا محمد تقی امینی، وغیرہ۔ اس فہرست میں بلاشبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا نام بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں مجھے مسلسل طور پر مولانا عبدالباری ندوی وفات (۱۹۷۶) سے علمی استفادہ کا موقع ملتا رہا جو ندوہ سے قریب ہی لکھنؤ میں رہتے تھے۔ میں نے ۱۹۶۶ کے آخر میں ان سے بیعت بھی کرلی۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ مُجاز تھے۔

میں دہلی ۱۹۶۷ میں آیا۔ اس کے بعد پھر دہلی ہی میں مستقل طور پر مقیم ہوگیا۔ یہاں بھی میرا تعلق مسلسل طور پر دہلی کے مدارس اور دہلی کے علماء سے جاری رہا۔ مثلاً مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا محمد میاں سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند، مولانا قاضی سجاد حسین، صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتح پوری، مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا عبدالخالق نقوی، وغیرہ۔

دہلی میں اپنی آمد ۱۹۶۷ کے بعد کثرت سے میں علی گڈھ کا سفر کرتا رہا۔ وہاں مولانا محمد تقی امینی (ناظم دینیات، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی) اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی وغیرہ سے علمی استفادہ کا سلسلہ جاری رہا۔ اس درمیان ایک بار کئی مہینہ تک مستقل طور پر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی جامع مسجد میں قیام کیا۔

اوپر جو مثالیں دی گئی ہیں وہ براہ راست طور پر تحریک مدارس کے ثمرات کا نتیجہ تھیں۔ یہ دراصل تحریک مدارس ہی کا کارنامہ ہے کہ ہر بستی اور ہر شہر میں ایسے تعلیمی ادارے قائم ہوگئے جہاں میں اور میرے جیسے دوسرے بہت سے لوگ داخلہ لے کر باقاعدہ طور پر دینی تعلیم حاصل کرسکیں۔ اسی طرح تقریباً ہر جگہ ایسے علماء وجود میں آگئے جو علمی تشنگی رکھنے والے کسی شخص کے لئے حصول فیض کا ذریعہ بن سکیں۔ اپنے آبائی گاؤں سے لے کر دہلی کے زمانۂ قیام تک میرے تقریباً ۸۰ سالہ سفر حیات میں ہر جگہ مجھ کو ایسے تعلیمی ادارے ملے اور ہر جگہ ایسی علمی شخصیتیں موجود تھیں جن سے میں استفادہ کرکے اپنے دینی علم کو ترقی دیتا رہا۔ اور یہ سب کچھ بلاشبہ تحریک مدارس کی وجہ سے ممکن ہوا۔

# فوائد و برکات

دینی مدارس کے فائدے اور برکتیں بہت زیادہ ہیں اور ان کا تعلق زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ہے۔ جس طرح علم کے فائدے کی کوئی حد نہیں، اسی طرح مدرسہ یا تعلیم گاہ کے فوائد کی بھی کوئی حد نہیں۔ یہاں صرف علامتی طور پر اس کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

## علم دین کا تسلسل

مدارس دینیہ کے ذریعہ مسلمانوں کو مختلف قسم کے فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک فائدہ وہ ہے جس کو علم دین کا تسلسل یا استمرار کہا جاسکتا ہے۔ یہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر مدارس دینیہ کا ہی کارنامہ ہے کہ علم دین کا سلسلہ نسل در نسل برصغیر ہند میں جاری رہا۔ جو کسی قوم کو مسلسل زندہ رکھنے کے لئے لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے میں ایک واقعاتی مثال دوں گا۔

۱۹۹۴ میں، میں نے اسپین (اندلس) کا سفر کیا۔ اسپین کے بارے میں یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ جب وہاں مسلمانوں کا آٹھ سو سالہ سیاسی اقتدار ختم ہوا تو اسی کے ساتھ وہاں کے مسلمانوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ مسلمان یا تو مار ڈالے گئے یا وہاں سے بھاگ کر وہ باہر چلے گئے۔ مگر اسپین کے سفر کے بعد مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ یہ بات خلاف واقعہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کے خاتمہ (۱۴۹۲ء) کے بعد بھی اسپین میں مسلمان ہزاروں کی تعداد میں باقی رہے۔ جو حادثہ پیش آیا وہ یہ نہیں تھا کہ اسپین سے مسلمانوں کا وجود مٹ گیا ہو، جو بات ہوئی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی بعد کی نسلوں میں تعلیم دین کا تسلسل (استمرار) ٹوٹ گیا۔ جیسا کہ معلوم ہے، مسلم اسپین میں علم کو بہت زیادہ فروغ ہوا مگر یہ سارا کام وہاں حکومت کی سرپرستی میں ہو رہا تھا۔ تعلیم و تدریس اور اشاعت دین کا سارا کام حکومت کر رہی تھی۔ یہ کام اتنا زیادہ بڑھا کہ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں اسپین کے مسلمان تقریباً صد فی صد تعلیم یافتہ ہو گئے تھے۔ حکومت کے خاتمہ کے بعد جب اس کی تعلیمی سرپرستی ختم ہوئی تو اسی کے ساتھ تعلیم کا سارا نظام بھی ختم ہو گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد کی مسلم نسلوں میں علم دین کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ نسل در نسل یہ انقطاعی

حالت قائم رہی یہاں تک کہ لوگ اپنی دینی شناخت کھو بیٹھے۔ اسپین کے مقامی معاشرہ میں وہ اس طرح ضم ہو گئے کہ انھیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ ان کے آباواجداد پہلے کبھی مسلمان تھے۔

انیسویں صدی میں جب ہندستان میں مسلم اقتدار کا خاتمہ ہوا تو یہاں کی مسلم نسلوں کے لئے بھی اسی قسم کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ یہاں بھی تعلیم و تدریس کا پورا کام حکومت کی سرپرستی میں انجام پاتا تھا۔ حکومت کے خاتمہ کے جو حالات پیدا ہوئے اس کے نتیجہ میں خارجی سرپرستی تقریباً ختم ہو گئی، مگر اس نازک موقع پر اللہ تعالیٰ نے علماء اسلام کو کھڑا کیا۔ انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ حکومت کے تعاون کے بغیر عام مسلمانوں کی مدد سے تعلیم دین کا نظام چلایا جائے۔ اللہ کی خصوصی توفیق سے یہ منصوبہ کامیاب رہا اور بڑھتے بڑھتے یہ حال ہوا کہ سارے ملک میں چھوٹے بڑے بے شمار مدارس کا جال بچھ گیا۔

اسی تعلیمی منصوبہ کا نتیجہ تھا کہ ہندستان اسپین جیسے حالات سے مکمل طور پر بچ گیا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس ملک کے مسلمان آج پوری دینی شناخت کے ساتھ یہاں رہ رہے ہیں۔ ان کی دینی زندگی یہاں اتنی مستحکم ہو چکی ہے کہ بار بار یہاں مختلف قسم کے طوفان آتے ہیں مگر وہ مسلمانوں کی دینی زندگی کے لئے کوئی خطرہ نہیں بنتے۔ ایک انگریزی مثل کے مطابق، اس ملک کے مسلمان ہر موقع پر طوفان کی بڑی چڑیا (big bird of the storm) ثابت ہوئے ہیں۔ اور یہ سارا کریڈٹ بڑی حد تک علماء کے قائم کردہ اس تعلیمی نظام کو جاتا ہے جس کو مدارس دینیہ کا نظام کہتے ہیں، جو نسل در نسل مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنانے کا کام انجام دے رہا ہے۔

## کتابوں تک رسائی

حدیث میں آیا ہے کہ: قیدوا العلم بالکتاب (الدارمی، مقدمۃ) یعنی علم کو لکھ کر محفوظ کرو۔ اس کے مطابق، ایک علم وہ ہے جو بشکل تحریر محفوظ ہو اور دوسرا علم وہ ہے جس کو تحریری طور پر محفوظ نہ کیا گیا ہو۔ عالم اور جاہل میں یہ فرق ہے کہ جاہل کی رسائی صرف غیر محفوظ علم تک ہوتی ہے اور عالم کی رسائی محفوظ علم تک بھی اور غیر محفوظ علم تک بھی۔

ایک شخص جو پڑھنا نہ جانتا ہو وہ صرف انہی باتوں کو جان سکتا ہے جن کو وہ سن سکتا ہو۔ وہ علوم جو اس کی سماعت سے باہر کتابوں اور تحریروں کی صورت میں محفوظ کئے گئے ہیں، ان علوم تک ایک جاہل کی

رسائی ممکن نہیں، جب کہ علم کا ۹۹ فی صد سے زیادہ حصہ وہی ہے جس کو تحریر کی صورت میں محفوظ کیا گیا ہے۔ تعلیم گاہیں اس محفوظ علم تک انسانوں کو پہنچنے کے قابل بناتی ہیں۔

میرا ذاتی معاملہ یہ ہے کہ میں فطری طور پر ایک تنہائی پسند آدمی ہوں۔ ایک بار ایک عرب شیخ نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا کہ انا رجل یحب العزلۃ (میں ایک تنہائی پسند آدمی ہوں) مدرسہ کی تعلیم نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اپنی تنہائی کو بھی مکمل طور پر حصول علم کے لئے استعمال کر سکوں۔ اگر میں مطالعۂ کتب کی صلاحیت سے محروم رہتا تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ لہذا میں صرف انہی چند باتوں کو جانتا جن کو میں نے اپنے آس پاس کے لوگوں سے اتفاقاً سن لیا ہو۔ مگر پڑھنے کے قابل ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اپنے تمام وقت کو علم و واقفیت کے اضافہ کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ پڑھنے کی صلاحیت کا یہ عظیم فائدہ ہے کہ آدمی اس حیثیت میں ہو جاتا ہے کہ وہ ساری دنیا کے اہل دماغ، حتی کہ وفات یافتہ انسانوں کی علم و تحقیق سے بھی واقفیت حاصل کر سکے۔

کسی کا قول ہے کہ جس کے پاس کتاب ہے وہ اکیلا نہیں ہے۔ یہ بات لفظ بلفظ درست ہے۔ ایک تعلیم یافتہ آدمی کتابوں کے ذریعہ اپنے دن اور رات کو عالی دماغ انسانوں کی صحبت میں گزارنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی کوئی اور خوش قسمتی نہیں ہو سکتی۔

دینی مدارس نے بے شمار لوگوں کو یہی تحفہ دیا ہے۔ ان مدارس نے لوگوں کو اس قابل بنایا کہ جو کچھ وہ سن نہیں سکتے اس کو پڑھ کر جان لیں۔ جن اعلیٰ انسانوں کو انہیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا وہ ان کی کتابوں کے ذریعہ ان کے ہم نشین بن جائیں۔

ابتدائی عمر سے میرا یہ مزاج ہے کہ میں چھوٹی چھوٹی چیزوں پر غور کرتا ہوں جس کو عام طور پر لوگ قابل غور نہیں سمجھتے۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر مجھ کو چھوٹی چھوٹی باتوں میں بڑے بڑے سبق ملتے ہیں۔ یہی وہ مخصوص صفت ہے جس کو قرآن میں "توسم" (الحجر ۷۵) کہا گیا ہے۔

مثال کے طور پر مدرسہ کی زندگی میں میں نے وہاں کے استاد مولانا سعید احمد ندوی سے کچھ کتابیں پڑھیں جن میں حدیث کی کتاب بھی شامل تھی۔ حدیث کو پڑھتے ہوئے میرے اندر ایک عجیب احساس پیدا ہوا۔ میں نے سوچا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو باتیں ۱۴۰۰ سال پہلے کہی تھیں اور جن کو سننے

کے لئے میں وہاں موجود نہ تھا ان کو میں آج کتاب میں پڑھ رہا ہوں۔ اسی طرح میں نے مولانا ڈاکٹر اکبر اصلاحی سے کئی کتابیں پڑھیں۔ دروس التاریخ الاسلامی پڑھتے وقت خاص طور پر مجھے یہ احساس ہوا کہ جن واقعات میں میں شخصی طور پر شریک نہ تھا ان کو میں آج کتاب کے ذریعہ جان رہا ہوں۔

مدرسہ میں میں نے عربی کی جو کتابیں پڑھیں ان میں سے ایک المفصل فی النحو تھی۔ یہ کتاب ہم لوگوں کو مولانا اختر احسن اصلاحی نے پڑھائی تھی۔ اس کتاب کے مصنف جار اللہ الزمخشری (۵۳۸ھ) ایک معتزلی عالم تھے۔ وہ اپنے اعتزال کو چھپاتے نہ تھے۔ حتی کہ وہ غیر معتزلی علماء پر سخت تنقید کرتے تھے۔ اس زمانہ کے معتزلی علماء کی تمام کتابیں تباہ کردی گئیں مگر الزمخشری کی کتاب المفصل فی النحو اور الکشاف عن حقائق التنزیل استثنائی طور پر باقی رکھی گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نحو اور تفسیر میں ان کتابوں کا کوئی بدل موجود نہ تھا۔ اس واقعہ کے ذریعہ تعلیم ہی کے دوران میں نے زندگی کی اس عظیم حقیقت کو جان لیا کہ آدمی اگر علم وہنر میں ممتاز درجہ حاصل کرلے تو اس کو نظر انداز کرنا اس کے شدید مخالفین کے لئے بھی ممکن نہیں۔

تعلیمی اداروں کے نصاب میں عام طور پر کلاسیکل کتابیں مقرر کی جاتی ہیں۔ یہی معاملہ مدارس کا بھی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے مدرسہ میں مقرر نصاب کے تحت جو کتابیں پڑھیں وہ زیادہ تر کلاسیکل کتابیں تھیں، یعنی قدماء کی لکھی ہوئی کتابیں۔ ان کتابوں کو پڑھتے ہوئے بار بار یہ احساس میرے دل میں آتا تھا کہ تحریر کیسی عجیب نعمت ہے کہ انسان ہر زمانہ کے اہل علم کی تصنیفات کو پڑھ سکتا ہے، بغیر اس کے کہ وہ اس زمانہ میں موجود رہا ہو۔

مدرسہ کی تعلیم آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ کتابوں تک رسائی حاصل کرسکے۔ اور جب ایک آدمی کتابوں سے اخذ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو عین اسی وقت وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ دنیا بھر کے اہل دماغ اور اہل فکر کے نتائج تحقیق سے استفادہ کرسکے۔ قوت مطالعہ نہ ہو تو آدمی کی شخصیت ایک محدود شخصیت ہوتی ہے۔ قوت مطالعہ حاصل ہوتے ہی اس کی شخصیت ایک آفاقی شخصیت بن جاتی ہے۔ پوری دنیا کا کتابی ذخیرہ اس کے لئے ایک وسیع علمی دسترخوان کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں میں نے اپنی مدرسی زندگی کے کچھ واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ایسا میں نے

اس لئے کیا ہے تاکہ مدرسہ کے تحت جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ پڑھنے والوں کو زیادہ حقیقی اور واقعی (factual) نظر آئے۔ یہ دراصل شخصی تجربہ کے حوالہ سے ایک عمومی حقیقت کا اظہار ہے۔ ان انفرادی واقعات کی تعمیم (generalisation) کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے کہ مدارس کے ماحول میں لوگوں کو کس قسم کی روحانی اور انسانی تربیت دی جاتی ہے۔

## سپلائی ہاؤس

دینی مدارس کا ایک اور عظیم فائدہ وہ ہے جس کو ایک لفظ میں سپلائی ہاؤس کہا جاسکتا ہے۔ سپلائی ہاؤس سے کیا مراد ہے اس کو میں ایک مثال سے واضح کروں گا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندستان میں بہت بڑے پیمانہ پر اسکول اور کالج اور یونیورسٹی کی صورت میں ایک عظیم تعلیمی ڈھانچہ قائم ہے۔ اس تعلیمی نظام کو ہمارے ملک کی حکومت بہت بڑی مالی مدد دے کر چلا رہی ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سیکولر تعلیمی ادارے ملک کے لئے ایک عظیم سپلائی ہاؤس کا کام کر رہے ہیں۔ ملک کو مسلسل ایسے افراد کی ضرورت ہے جو اس کی اقتصادی اور قومی مشین کو چلا سکیں۔ یہ ادارے یہی کام انجام دے رہے ہیں۔ ملک کو اپنے مختلف شعبوں کے لئے مسلسل قابل اعتماد کارکن درکار ہیں ـــــ ٹیچر، کلرک، افسر، مینیجر، ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، سپروائزر، ایڈیٹر، پائلٹ، سکریٹری، ایڈمنسٹریٹر، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے افراد انہی سیکولر تعلیمی اداروں سے پیدا ہو رہے ہیں جن کو اسکول، کالج اور یونیورسٹی کہا جاتا ہے۔ یہی معاملہ وسیع مسلم ملت کا بھی ہے۔ اس ملک میں بسنے والی تقریباً بیس کرور مسلم ملت کو مسلسل ایسے افراد درکار ہیں جو اس کی مختلف دینی و ملی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ ان سارے افراد کی فراہمی کے لئے مدارس دینیہ گویا ایک مستقل "سپلائی ہاؤس" کا کام کر رہے ہیں۔

ہندستان میں اس وقت تقریباً پانچ لاکھ مسجدیں ہیں ان مسجدوں کو امام انہی دینی مدارس سے ملتے ہیں۔ بیشمار تعلیمی اداروں کو یہیں سے مدرسین سپلائی ہو رہے ہیں۔ اسی طرح ملی اداروں کے لئے ناظم، تصنیف و تالیف کے شعبوں کے لئے مصنف، ملی صحافت کے لئے ایڈیٹر، انہی مدارس سے سپلائی ہوتے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں میں بہت سی جماعتیں قائم ہیں۔ ان تمام جماعتوں کو بھی اکثر افراد اسی سپلائی ہاؤس سے فراہم ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر تبلیغی جماعت براہ راست طور پر مدارس کی پیداوار ہے۔

یہ مدارس میں تیار ہونے والے علماء ہی تھے جنہوں نے اس جماعت کو شروع کیا اور پھر اس کو موجودہ عالمی وسعت تک پہنچایا۔

اس سلسلہ میں ایک نہایت اہم سبق آموز بات یہ ہے کہ منفی اقدام ہمیشہ بے فائدہ ثابت ہوتا ہے۔ جب کہ مثبت اقدام نہ صرف اپنے اصل نشانہ کو پورا کرتا ہے بلکہ اس کے ذریعہ بہت سے مزید فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں جس کا اس کے ابتدائی رہنماؤں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مثال کے طور پر موجودہ زمانہ میں ایک نئی چیز وجود میں آئی جس کو کمپیوٹر کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے ہر جگہ اردو آپریٹر اور عربی آپریٹر کی ضرورت تھی۔

کمپیوٹر کے اس نئے کام کے لئے بھی افراد کار زیادہ تر مدارس دینیہ کے سپلائی ہاؤس ہی سے فراہم ہوئے۔ موجودہ زمانہ کی سیکولر یونی ورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز اور مسلم تاریخ کے مطالعہ کے نام پر ایسے شعبے کھلے جن میں داخل ہو کر مسلمان یونی ورسٹی کی سطح پر اسلام کی علمی نمائندگی کر سکیں۔ ان شعبوں کے لئے افراد بھی انہی مدارس دینیہ سے حاصل ہوئے۔

اسی طرح سفارت خانوں اور ریڈیو اور امور خارجہ سے تعلق رکھنے والے مختلف شعبوں نیز ثقافتی اداروں اور برآمدی تجارت وغیرہ کے لئے اردو داں اور عربی داں افراد کی ضرورت پیش آئی۔ یہ ضرورت بھی زیادہ تر مدارس دینیہ کے سپلائی ہاؤس سے پوری ہوئی، وغیرہ۔

موجودہ زمانہ میں صنعتی انفجار (industrial explosion) کے بعد لوگوں کے لئے عام مواقع کھلے کہ وہ دنیا کے مختلف ملکوں میں بڑی تعداد میں جا سکیں۔ ان جانے والوں میں ایک قابل لحاظ تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو مدارس دینیہ میں تعلیم پائے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا بیرونی ملکوں میں جا کر قیام کرنا ایک مزید فائدے کا سبب بنا۔ ان لوگوں کے بیرونی ملکوں میں آباد ہونے ہی کا یہ فائدہ تھا کہ بعد کو جب اردو داں علماء نے اپنے دینی اسفار کے تحت ان ملکوں کا دورہ کیا تو یہ لوگ پیشگی طور پر ان علماء کے لئے وہاں مددگار اور رابطہ کار کی حیثیت سے موجود تھے۔

اس طرح مدارس دینیہ کی صورت میں جو سپلائی ہاؤس قائم ہوا، اس کا دائرہ کسی مخصوص حد تک محدود نہ رہا۔ اس سپلائی ہاؤس سے ملک کے اندر کی دینی ضرورتیں بھی پوری ہوئیں اور ملک کے باہر کی

دینی ضرورتیں بھی۔ان لوگوں نے ہندستان میں بھی دینی مدارس قائم کئے اور یورپ وامریکہ اور افریقہ میں بھی۔ان کے ذریعہ ہر علمی شعبہ کو قابل کار افراد ملے اور مل رہے ہیں۔

اس دنیا میں ہر چیز میں مسلسل ترقی کی گنجائش رہتی ہے۔مذکورہ سپلائی ہاؤس کو مفید تر بنانے کے لئے بھی بلاشبہہ بہت سے امکانات موجود ہیں۔مشترک غور وفکر کے ذریعہ ان امکانات کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے اور تعلیم وتربیت کے اس نظام کو اور زیادہ مفید بنایا جاسکتا ہے۔

ذہنی بُعد کا خاتمہ

مدارس دینیہ کے ذریعہ ایک اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اس کی وجہ سے ملت کے خواص اور ملت کے عوام کے درمیان وہ نقص پیدا نہ ہوسکا جس کو ذہنی بُعد (intellectual gap) کہا جاتا ہے۔

قرآن میں یہود کے تذکرہ کے تحت بتایا گیا ہے کہ ان میں ایک فریق وہ ہے جو علم وعقل رکھتا ہے (البقرہ ۷۵) یہاں "فریق" سے مراد یہود کے علماء ہیں جن کو احبار کہا جاتا تھا۔اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ یہود میں دوسرا طبقہ ان کے عوام کا ہے۔ان کی بابت قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: ومنهم اميون لايعلمون الكتاب الا امانی وان هم الا يظنون (البقرہ ۷۸) یعنی اور ان میں اَن پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو مگر آرزوئیں۔ان کے پاس گمان کے سوا اور کچھ نہیں۔

قرآن کی اس آیت میں امّیون کا لفظ آیا ہے۔امیون جمع کا لفظ ہے۔اس کا واحد امی ہے۔امی عربی زبان میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو نہ لکھنا جانتا ہو اور نہ پڑھنا جانتا ہو (من لایکتب و لا یقرا)۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، الجزء الثانی، صفحہ ۵۔

اصل یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں یہود کے اندر عمومی تعلیم کا رواج نہ تھا۔کچھ مخصوص خاندان محدود طور پر تعلیم حاصل کرتے تھے۔یہی لوگ تھے جو اپنی مذہبی کتابیں پڑھتے تھے۔ان کے علاوہ یہود کی بہت بڑی اکثریت جاہل رہتی تھی۔اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں عام طور پر خاندانی تعلیم کا رواج تھا نہ کہ عمومی تعلیم کا۔عوام کی تعلیم وتدریس کے لئے ان کے یہاں مدرسے نہ ہوتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہود کے درمیان بڑے پیمانہ پر خواص اور عوام کی تقسیم قائم ہوگئی۔کچھ افراد یا کچھ خاندان کو علماء کا درجہ حاصل ہوتا تھا۔اور بقیہ لوگ طبقۂ عوام میں شمار ہوتے تھے جو نہ پڑھنا جانتے تھے اور نہ ان

کی براہ راست رسائی مذہبی کتابوں تک ہو سکتی تھی۔

اس کے نتیجہ میں یہود کے علماء اور عوام کے درمیان ایک ذہنی بُعد (intellectual gap) قائم ہو گیا۔ ان کے عوام نہ خود اپنی مذہبی کتابوں کو پڑھ سکتے تھے اور نہ ان کے اندر یہ صلاحیت تھی کہ وہ اپنے علماء کی علمی باتوں کو سمجھ سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام دھیرے دھیرے علماء سے دور ہوتے چلے گئے۔ مذہب کے نام سے ان کے پاس توہمات (superstitions) اور آرزوؤں (wishful thinking) کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ خواص اور عوام کے درمیان اس ذہنی بُعد کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کی اصلاح ناممکن ہو گئی کیوں کہ گہری اصلاح کی بات آسمانی کتابوں کے حوالہ سے کرنی پڑتی ہے، اور ان کے عوام اپنی جہالت کی بنا پر اس قابل ہی نہ تھے کہ وہ کتابی زبان اور علمی اسلوب کو سمجھ سکیں۔

یہی حال قدیم زمانہ میں تمام قوموں کا تھا۔ اس کی ایک مثال ہندستان میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہندستان میں ہزاروں سال سے خواص و عوام کی یہی تقسیم بہت بڑے پیمانہ پر قائم تھی۔ علم یا پڑھنا لکھنا صرف برہمن خاندانوں کے درمیان محدود تھا۔ ایسے تعلیمی ادارے موجود نہ تھے جہاں عوام لکھنا پڑھنا سیکھیں۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم زیادہ تر کچھ برہمن خاندانوں میں منحصر ہو کر رہ گیا اور ملک کے ۹۵ فیصد عوام اپنی جہالت کی بنا پر توہمات کو مذہب سمجھ کر اس میں مبتلا رہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ علم کو خواص کے دائرہ سے نکال کر عوام کے دائرہ تک پہنچانے کا کام تاریخ میں پہلی بار اسلام نے کیا۔ مسلم علماء نے علم کی توسیع کا یہ کام دنیا کے ہر ملک میں انجام دیا جن میں سے ایک ملک بلاشبہہ ہندستان بھی تھا۔

علماء اسلام نے تعلیم و تدریس کا جو کام شروع کیا اس کا فائدہ فطری طور پر یہاں کی غیر مسلم آبادی کو بھی پہنچا۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہندستان میں مسلم دور کے آغاز سے پہلے ہندوؤں میں صرف برہمن اور اعلیٰ حیثیت کے کچھ لوگ تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ ہندو عوام زیادہ تر اس سے محروم تھے۔ مسلم عہد میں جب ملک میں عمومی تعلیمی ادارے کھولے گئے تو مسلم طلبہ کے ساتھ ہندو طلبہ بھی اس میں داخلہ لے کر تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اس کے بعد جب ۱۹ویں صدی میں مسلم علماء نے زیادہ بڑے پیمانہ پر مدارس کھولنا شروع کیا تو ان مدارس کے ذریعہ مسلمانوں کے ساتھ غیر

مسلموں کو بھی فائدہ پہنچنے لگا۔

مدارس کی خاص صفت یہ تھی کہ وہ گاؤں گاؤں میں کھولے جارہے تھے۔اس طرح ہر خاندان کے لئے ممکن ہو گیا کہ وہ اپنے بچوں کو مدرسہ میں بھیج کر تعلیم دلائے۔ فطری طور پر والدین اپنے چھوٹے بچوں کو دور کسی شہر میں بھیجنے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے لیکن جب ان کی اپنی بستی میں مدرسہ کھل گیا تو ان کے لئے ممکن ہو گیا کہ وہ اپنے بچہ کو مدرسہ کی تعلیم میں شامل کر دیں۔ مدارس کے اس عمومی پھلاؤ سے بڑی تعداد میں غیر مسلموں کو بھی فائدہ پہنچا۔ مثال کے طور پر آزاد ہندستان کے پہلے پریذیڈنٹ ڈاکٹر راجیندر پرشاد نے اپنے بچپن میں ابتدائی تعلیم بہار کے ایک مسلم مدرسہ میں حاصل کی تھی۔

اس طرح اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے عوام اور خواص کے درمیان ذہنی بُعد (intellectual gap) کے تباہ کن نقصانات کو سمجھا اور اس کو دور کرنے کی موثر کوشش کی۔

اسلام کی اس روایت کو ہندستان کے علماء نے اس ملک میں بھی پوری طرح باقی رکھا۔ برصغیر ہند میں علماء نے مدارس کا جو سلسلہ شروع کیا اس کا ایک اہم فائدہ یہ تھا کہ خواص اور عوام یا علماء اور عوام کے درمیان ذہنی بعد (intellectual gap) کا مسئلہ پیدا نہ ہو سکا۔ بستی بستی اور شہر شہر مدارس کی کثرت نے کروروں لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا۔ اس طرح تعلیم یافتہ ہونے کی بنا پر اسلامی کتابیں عوام کی دسترس میں آگئیں۔ لوگ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو گئے کہ وہ علماء کی باتوں کو سمجھیں اور اس کے مطابق اپنے شعور کی تعمیر کر سکیں۔ اگر مدارس کے ذریعہ اس ذہنی بُعد کو توڑا نہ جاتا تو خدانخواستہ مسلمانوں میں بھی وہی تباہ کن تقسیم قائم ہو جاتی جو یہود کی تاریخ میں احبار اور امیون کی صورت میں اور ہندوؤں میں برہمن اور غیر برہمن کی صورت میں قائم ہوئی۔

علماء ہند کا مزید کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دینی تعلیم کو فری ایجوکیشن (مفت تعلیم) کی حیثیت دے دی۔ عوام بیشتر حالات میں معاشی تنگی کا شکار رہتے ہیں۔ اس بنا پر وہ اپنے ذاتی خرچ پر تعلیم حاصل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اگر مدارس کا نظام فیس کی بنیاد پر قائم کیا جاتا تو بیشتر مسلمانوں کا حال یہ ہوتا کہ مدارس کے باوجود وہ علم حاصل کرنے سے محروم رہتے۔ علماء ہند کا یہ ایک غیر معمولی کارنامہ ہے کہ انھوں نے اللہ کے بھروسہ پر دینی تعلیم کے نظام کو فری ایجوکیشن (مفت تعلیم) کے اصول پر رائج کیا

اور ہر قسم کی مشکلوں کے باوجود اس کو قائم رکھا۔

انگریزی حکومت نے جو اسکول اور کالج کھولے وہ زیادہ تر شہروں میں واقع تھے۔ اس طرح وہ بڑی حد تک گاؤں کی دسترس سے باہر تھے جہاں ملک کی تقریباً ۷۵ فیصد آبادی رہتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں علماء نے یہ کیا کہ انھوں نے گاؤں گاؤں میں مکتب اور مدرسہ کھول دیا۔ اس طرح انھوں نے دینی تعلیم کو عملاً ہر خاندان کے دروازہ (doorstep) تک پہنچادیا۔

مثال کے طور پر میں یوپی کے ایک دور دراز گاؤں میں پیدا ہوا، مگر یہاں بھی یہ حال تھا کہ گاؤں کی مسجد میں ایک مدرسہ موجود تھا۔ یہ مدرسہ ڈاکٹر عبدالعلی خاں صاحب کے خاندان نے اپنی ذاتی ذمہ داری پر قائم کیا تھا۔ اب جناب یمین الاسلام خاں (انجینئر) وغیرہ کے تعاون سے اس کو بہت زیادہ ترقی دی جاری ہے۔ عام قاعدہ کے مطابق اس مدرسہ میں کوئی تعلیمی فیس نہ تھی۔ ابتدائی عمر ہی میں مجھے اس مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ اگر گاؤں کے اندر یہ مدرسہ نہ ہوتا تو میرے سرپرست کبھی بھی مجھ کو کم عمری میں کسی دور دراز مقام پر بھیجنے کی ہمت نہ کرپاتے۔ گاؤں کے اس مدرسہ میں میں نے اردو اور فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد میں مزید تعلیم کے لئے دوسرے مقام پر گیا اور وہاں ایک بڑے مدرسہ میں داخلہ لے کر عربی زبان اور دینی علوم کی تکمیل کی۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں برصغیر ہند میں اسلام اور ملت اسلام کے نام پر بہت سی تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ان کے گرد اکٹھا ہو گئی۔ اس سے قطع نظر کہ یہ تحریکیں کتنی نتیجہ خیز تھیں، ان تحریکوں کی مقبولیت اسی لئے ممکن ہوئی کہ مدارس دینیہ کے عمومی پھیلاؤ نے خواص اور عوام کے درمیان ذہنی بُعد کو ختم کر دیا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں جو بھی تحریک اٹھی اس نے قوم کے اندر اپنے لئے تیار ذہن (prepared mind) پایا۔ یہ تمام تر انہیں مدارس کی تعلیمی مہم کا نتیجہ تھا۔

اگر تعلیم کی عمومی اشاعت کے ذریعہ خواص اور عوام کے درمیان ذہنی دوری کا خاتمہ نہ ہو گیا ہوتا تو ان تحریکوں کو کبھی یہ مقبولیت حاصل نہ ہوتی۔ ایسی حالت میں تحریکوں کے علم بردار اخبار اور رسالے جاری کرتے مگر یہاں ان کا کوئی پڑھنے والا نہ ہوتا۔ وہ جلسے کرتے مگر ان جلسوں میں ایسے لوگ

شریک ہوتے جو سننے کے باوجود کچھ نہ سمجھتے۔ ہمارے خواص ایسے الفاظ لکھتے اور بولتے جن کا مفہوم وہ خود تو جانتے مگر وہی عوام ان سے بے خبر رہتے جن کو باخبر کرنے کے لئے یہ الفاظ لکھے اور بولے جارہے تھے۔ ایسی حالت میں ان تحریکوں کا جو انجام ہوتا وہ پیشگی طور پر معلوم ہے۔

## دینی وملی انفراسٹرکچر

دینی مدارس کے ذریعہ ملت کو جو فائدے حاصل ہوئے ان میں سے ایک فائدہ وہ ہے جس کو دینی انفراسٹرکچر کہا جاسکتا ہے۔ کسی بھی کام کو مؤثر انداز میں چلانے کے لئے ہمیشہ اس کے موافق ایک عملی ڈھانچہ یا انفراسٹرکچر (infrastructure) درکار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تجارتی کاروبار کسی ملک میں اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب کہ تجارتی ساز وسامان کی منتقلی کے لئے پورے ملک میں اچھی سڑک کی سہولت موجود ہو۔ ہر مقام پر ٹیلی فون کا عمدہ انتظام ہو تاکہ ملک کے مختلف حصوں میں باآسانی پیغامات کو بھیجنا ممکن ہوسکے، وغیرہ، وغیرہ۔

یہی معاملہ دینی اور ملی کام کا ہے۔ دینی وملی کاموں کے لئے بھی اس کے موافق ایک وسیع انفراسٹرکچر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح مادی انفراسٹرکچر کے بغیر مادی کاروبار ترقی نہیں کرتا، اسی طرح دینی انفراسٹرکچر کے بغیر دینی کام بھی زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔

دینی مدارس کا جو کام برصغیر ہند میں شروع کیا گیا وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک ایسا کام تھا جو مسلسل توسیع پذیر تھا۔ مدرسہ کے کام کی نوعیت یہ تھی کہ مدرسہ میں پڑھ کر تیار ہونے والا ہر نوجوان اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتا تھا کہ وہ اپنی مادر علمی کی طرح خود بھی نئے مدارس قائم کرسکے۔ چنانچہ دینی مدارس کی تحریک کا آغاز ہوتے ہی یہ کام خود اپنے فطری مزاج کے زور پر آگے بڑھنے لگا۔ مدرسہ کے فارغین مدرسہ سے نکلنے کے بعد نئے مدارس قائم کرنے لگے۔

مدارس کے کام کی یہ توسیع حسابی تناسب (arithmetical proportion) سے آگے نہیں بڑھی، یعنی اس کے بڑھنے کی رفتار ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، نہ تھی بلکہ وہ جیومیٹریکل تناسب (geometrical proportion) سے بڑھنا شروع ہوئی۔ یعنی اس کے بڑھنے کی رفتار یہ تھی ــــ ۱، ۲، ۴، ۸، ۱۶، ۳۲، ۶۴۔ مزید یہ کہ یہ تحریک خود اپنی نوعیت کے اعتبار سے قابل بقا (sustainable)

تحریک تھی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس دینیہ کی تحریک نہ صرف یہ کہ باقی رہی بلکہ وہ خود اپنی داخلی طاقت سے روز افزوں تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی یہاں تک کہ وہ بڑھتے بڑھتے پورے برصغیر ہند میں پھیل گئی۔ مسجد گویا پیشگی طور پر مدرسہ کے لئے بنی بنائی بنیاد (base) تھی۔ چنانچہ تقریباً ہر مسجد میں چھوٹا یا بڑا مدرسہ قائم ہو گیا۔ جہاں مسجد ناکافی معلوم ہوئی وہاں مسجد کے باہر مستقل عمارت کی صورت میں مدارس قائم ہونے لگے۔ یہاں تک کہ پورے برصغیر ہند میں مدارس کا جال بچھ گیا۔ جن کی تعداد بلا مبالغہ لاکھوں تک پہنچتی ہے۔

یہ مدارس اصلاً دینی تعلیم کے لئے قائم کئے گئے تھے مگر قانون فطرت کے تحت وہ ایک ایسے انفراسٹرکچر کی صورت اختیار کر گئے جو اس ملک میں ہر دینی اور ملی مہم کے لئے بنیاد کا کام دے سکیں۔ چنانچہ بیسویں صدی میں جتنی بھی دینی یا ملی تحریکیں اس خطۂ ارض میں اٹھائی گئیں، ان سب کے لئے بنیادی زمین یہی ادارے بنے جن کو مدارس دینیہ کہا جاتا ہے۔

اس مدت میں جب بھی کوئی دینی اور ملی تحریک اٹھائی گئی تو انہی مدارس سے اس کو تیار ذہن (prepared mind) اور معاون ملے۔ انہی مدارس نے ہر تحریک کے رہنماؤں کا استقبال کیا۔ انہی مدارس نے پورے ملک میں اس تحریک کے حق میں موافق فضا تیار کی۔ ملی تحریکوں کے رہنما جب ملک کا دورہ کرتے ہیں تو یہی مدارس ان کے لئے مقامی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ تعلیمی ادارے ہر جگہ، ان کے لئے قیام گاہ سے لے کر جلسہ گاہ تک ہر ضرورت کی فراہمی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اگر مدارس دینیہ کا یہ جال نہ ہوتا تو موجودہ زمانہ میں اٹھنے والی کسی ملی تحریک کے لئے یہ ممکن نہ ہوتا کہ وہ اس پھیلاؤ اور وسعت کو حاصل کرے جو کہ عملاً اس نے حاصل کیا۔ کسی تحریک کی صحت کو جانچنے کا ایک معیار یہ ہے کہ جب وہ شروع ہو تو نہ صرف اپنا براہ راست نشانہ پورا کرے بلکہ اسی کے ساتھ وہ دوسرے بہت سے مثبت اور مفید نتائج پیدا کرنے کا سبب بن جائے۔

باغبان جب ایک درخت لگائے تو اس کا براہ راست نشانہ اس سے پھل لینا ہوتا ہے مگر جب درخت بڑھ کر تیار ہوتا ہے تو پھل کے علاوہ لوگوں کو اس سے دوسرے بہت سے فائدے بھی ملنے لگتے ہیں ــــــ مثلاً سایہ، ہریالی، لکڑی، پھول، وغیرہ۔ اسی طرح جب انسانی معاشرہ میں کوئی صالح تحریک

چلائی جائے تو اس سے بہت سے ضمنی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ مدارس دینیہ کا ہے۔ یہ مدارس اصلاً علم دین کو فروغ دینے کے لئے قائم کئے گئے تھے مگر جب وہ قائم ہوگئے تو وہ بہت سے دوسرے فوائد کا ذریعہ بھی بن گئے۔ انہی میں سے ایک خاص فائدہ یہ تھا کہ سارے ملک میں پھیلے ہوئے یہ مدرسے ملی تحریکوں کے لئے انفراسٹرکچر کا کام دینے لگے۔

عربی کا ایک مقولہ ہے کہ تعرف الاشیاء باضدادھا (چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں) اس اصول کے مطابق، تھوڑی دیر کے لئے ملک سے مدارس دینیہ کے وجود کو حذف کر دیجئے۔ اس کے بعد یہ سوچئے کہ ملک میں اگر کوئی ملی تحریک چلائی جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ وہ انجام یہ ہوگا کہ شروع ہوتے ہی یہ تحریک محسوس کرے گی کہ ملک میں قدم رکھنے کے لئے اس کے پاس کوئی زمین یا معاون ڈھانچہ موجود نہیں۔

کسی صحت مند تحریک کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ جب شروع ہو تو وہ لوگوں کو ایک ہی فائدہ نہ دے بلکہ لوگوں کو اس سے متنوع قسم کے فائدے حاصل ہوں۔ وہ نہ صرف یہ کہ کوئی نیا مسئلہ پیدا نہ کرے بلکہ وہ ہر متوقع اور غیر متوقع پہلو سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتی رہے۔

یہی معاملہ مدارس دینیہ کی تحریک کا تھا۔ وہ پورے معنوں میں ایک صحت مند تحریک تھی۔ اس لئے وہ ہر اعتبار سے مفید بنتی رہی۔ اس کی افادیت کی لمبی فہرست میں ایک چیز وہ بھی ہے جس کو انفراسٹرکچر کہا جاتا ہے۔

مدارس دینیہ کی تحریک کے درست ہونے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس سے ملت کے اندر صحیح مزاج پیدا ہوا۔ وہ صحیح زاویۂ نظر پیدا ہوا جس سے لوگ چیزوں کو درست طور پر دیکھ سکیں۔ ملت منفی نقطۂ نظر سے بچ کر مثبت نقطۂ نظر کی حامل بن گئی۔ ملت کے افراد موانع سے ٹکرانے کے بجائے مواقع کو استعمال کرنے لگے، وغیرہ۔

## اچھے شہری

مدارس دینیہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ذریعہ ملک کو اچھے شہری فراہم ہو رہے ہیں۔ اچھے شہری، یعنی ایسے لوگ جو اخلاقی اصولوں اور انسانی قدروں کے مطابق جینے والے ہوں۔ ایسے افراد کی ضرورت ہر سماج کو ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اچھے شہری کے بغیر کوئی سماج اچھا سماج نہیں بن سکتا۔

مگر آج کے ہندستان میں ایسے ادارے موجود نہیں جو اچھے شہری بنانے کا کام کر رہے ہوں۔ ملک میں اسکول اور کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر جو تعلیمی نظام قائم ہے وہ سیکولرزم پر مبنی تعلیمی نظام ہے۔ چنانچہ ایسے افراد کی تیاری اس کے مقاصد میں شامل ہی نہیں۔ اس تعلیمی نظام کا واحد نشانہ لوگوں کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنی معاشی اور مادی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔

ایسی حالت میں مدارس دینیہ کا نظام ہی ملک میں وہ واحد بڑا نظام ہے جو اس اخلاقی مقصد کی تکمیل کر رہا ہے یا کر سکتا ہے۔ ان مدارس کا مقصد لوگوں کو اسلام کی تعلیم دینا ہے۔ مکتب کے ابتدائی مرحلہ سے لے کر دارالعلوم تک ہر مرحلہ میں یہی مقصد اس کے سامنے رہتا ہے۔ اب دیکھئے کہ اسلام کیا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بعثت لاتمم حسن الاخلاق (موطا امام مالک) یعنی میں دنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تاکہ میں حسن اخلاق کی تکمیل کروں۔ اسی طرح آپ نے فرمایا: اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقا (مسند احمد) یعنی سب سے زیادہ کامل ایمان اس کا ہے جو اخلاق میں سب سے زیادہ اچھا ہو۔

مدارس دینیہ میں جو نوجوان تعلیم و تربیت پاتے ہیں وہ اپنی پوری تدریسی مدت میں اسی قسم کی باتیں پڑھتے اور سنتے ہیں۔ مدارس کا پورا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ وہاں آدمی کو صبح و شام اخلاق و انسانیت کی تربیت دی جاتی ہے۔ وہاں رسول اور اصحاب رسول کو زندگی کے لئے رول ماڈل کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ مدارس عملاً ملک کے لئے اچھے شہری اور بہتر انسان فراہم کرنے کے ادارے بن گئے ہیں۔

یہاں میں اس کی وضاحت کے لئے چند مثالیں دوں گا۔ ایک بار میں ہماچل پردیش کے ایک مدرسہ میں گیا۔ اس مدرسہ کو دیوبند کے ایک عالم نے قائم کیا ہے۔ اس مدرسہ کے آس پاس زیادہ تر ہندوؤں کی آبادیاں ہیں، یہ مدرسہ جب قائم ہوا تو ان پڑوسی ہندوؤں کو تشویش ہوئی۔ وہ سوچنے لگے کہ مدرسہ کے لوگ پتہ نہیں کس قسم کی مصیبت ہمارے لئے کھڑی کریں گے۔ مگر ان کا یہ خوف بے بنیاد تھا۔ چنانچہ تجربات کے بعد دھیرے دھیرے وہ ختم ہوتا چلا گیا۔

مثال کے طور پر مدرسہ کے قریب ہندوؤں کے ایک گاؤں میں آگ لگ گئی۔ یہ رات کا وقت تھا۔ جب آگ کے شعلے بلند ہوئے تو مدرسے والوں کو اس کی خبر ہو گئی، وہ کسی طلب کے بغیر دوڑ کر اس گاؤں

میں پہنچے اور آگ بجھانے میں ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اللہ کی مدد ہوئی اور فوراً آگ بجھ گئی۔

اس طرح کے واقعات و تجربات کے بعد ہندو لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ وہ مدرسہ کو اپنے حق میں ایک نعمت سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہ اب یہ حال ہے کہ یہ ہندو اپنے ذاتی نزاعات کو حل کرنے کے لئے مدرسہ والوں کے پاس آتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو مدرسہ والوں پر پورا بھروسہ ہے۔

اسی طرح ایک بار میں ایک اور مدرسہ میں گیا۔ وہاں مدرسہ سے ملا ہوا ایک باغ تھا۔ اس زمانہ میں باغ کو ایک ہندو ٹھیکہ دار نے لیا تھا۔ اس ہندو باغبان سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ جب میں یہاں آیا تو میں ڈرتا تھا کہ مدرسہ کے لڑکے ہمارے باغ کا نقصان کریں گے۔ مگر میرا یہ خیال غلط نکلا۔ مدرسہ والوں کا حال یہ ہے کہ پیڑ کا پھل توڑنا تو در کنار زمین پر گرے ہوئے پھل کو بھی وہ نہیں اٹھاتے۔ ملک بھر میں پھیلے ہوئے دینی مدارس اسی طرح اچھے شہری تیار کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ اس کی مثالیں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں۔

# دینی مدارس کا امتیاز

دینی مدارس کی اہم ترین امتیازی صفت یہ ہے کہ ان کی بنیاد علم حقیقی پر قائم ہے، یعنی دین اسلام پر جو کہ مذہب کا واحد محفوظ ایڈیشن ہے۔ یہ ایک بے حد اہم بات ہے کیوں کہ دوسرے جتنے بھی تعلیمی نظام ہیں، ان سب کی بنیاد علم ظنی پر قائم ہے نہ کہ علم حقیقی پر۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دینی مدارس میں جو لوگ تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہیں وہ اس حیثیت میں ہوتے ہیں کہ وہ اپنے عقیدہ و عمل کو اعتماد کی بنیاد پر قائم کر سکیں، وہ اس یقین کے ساتھ جئیں کہ انہوں نے جو کچھ پایا ہے وہ عین سچائی ہے، اس میں جھوٹ کی کوئی آمیزش نہیں۔

اکثر دینی مدارس میں قرآن کو تقریباً مکمل طور پر بطور نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تمام مدارس میں قرآن کو سب سے زیادہ بلند مقام حاصل رہتا ہے۔ طلبہ اور اساتذہ دونوں روزانہ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ گفتگو اور تقریروں میں بار بار قرآنی آیتوں کے حوالے دئے جاتے ہیں۔ طلبہ نصاب سے باہر جو کتابیں اور جرائد پڑھتے ہیں ان میں عام طور پر بحث کا مرکزی نکتہ قرآن ہی ہوتا ہے۔ اس طرح عملی طور پر تمام طلبہ ہر روز براہ راست یا بالواسطہ انداز میں قرآن کا درس لیتے رہتے ہیں۔

یہی معاملہ حدیث کا ہے۔ وہ مدارس کے نصاب میں لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل رہتی ہے۔ اکثر بڑے مدارس میں صحاح ستہ مکمل یا منتخب انداز میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مدرسہ کے ماحول میں طالب علم ہر روز حدیث کے حوالے یا اس کے تذکرے سنتا ہے۔ اس طرح عملی طور پر ہر طالب علم کو مدرسہ کی پوری زندگی میں مسلسل طور پر حدیث رسول کی فکری خوراک ملتی رہتی ہے۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مدارس اپنے طلبہ کو ذہنی اور روحانی حیثیت سے ایک ایسی تربیت دیتے ہیں جو کسی اور نظام تعلیم میں سرے سے ممکن ہی نہیں۔ دوسرے اداروں میں اگر تعلیم کی بنیاد انسانی علم پر ہے تو دینی اداروں میں تعلیم کی بنیاد خدائی علم پر۔

یہاں میں چند تقابلی مثالیں دوں گا جن سے اندازہ ہوگا کہ دینی مدرسہ اور غیر دینی مدرسہ میں کیا فرق ہے۔ وہ کون سے امتیازی اوصاف ہیں جو غیر دینی تعلیم گاہوں کے مقابلہ میں دینی تعلیم گاہوں کو حاصل ہیں۔

۱۔ غیر دینی درس گاہیں خواہ وہ ملک کے اندر ہوں یا ملک کے باہر، سب کی سب عملاً ایک ہی مقصد کے تحت قائم ہیں، اور وہ یہ ہے کہ طالب علم کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ دنیا میں اچھا جاب حاصل کر سکے۔ ہر جگہ جاب رخی تعلیم (Job-oriented education) کا رواج ہے۔ گویا کہ یہ تعلیم گاہیں انسان کو حیوانِ کاسب (earning animal) بنانے کے کارخانے ہیں۔

دینی مدارس کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایک لفظ میں کہا جاسکتا ہے کہ دینی مدارس خدا رخی تعلیم (God-oriented education) کے ادارے ہیں۔ وہ انسان کے اندر اعلیٰ مقصدیت کا شعور جگاتے ہیں۔ وہ انسان کو مادی سطح سے اٹھا کر روحانی یا ربانی سطح پر جینا سکھاتے ہیں۔

۲۔ غیر دینی مدارس عملی طور پر یہ سبق دیتے ہیں کہ دنیا کی مادی چیزوں کا حصول ہی ہماری زندگی کی آخری منزل ہے۔ جب کہ دینی مدارس ہر طالب علم کے اندر یہ ذہن بناتے ہیں کہ دنیا کی مادی چیزیں تمہاری ضرورت ہیں نہ کہ تمہارا مقصد۔ غیر دینی مدارس کا جو فلسفہ ہے اس میں انسان کے لئے آزادی کا پیغام تو موجود ہے مگر آزادی کی حدود (limitations) کا کوئی تعین نہیں۔ اس کا ایک نتیجہ وہ ہے جو جدید ترقی یافتہ ملکوں میں بے قید جنسی تعلقات اور بے قید لذت پسندی کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ غیر دینی درسگاہوں میں اس بے قیدی پر روک لگانے کا کوئی قانون نظری طور پر موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سماجوں میں ظاہری ترقیوں کے باوجود حقیقی انسانیت کا ارتقاء ممکن نہ ہو سکا۔

اس کے برعکس دینی درسگاہوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کی بنیاد خدائی شریعت کے اصول پر قائم ہے۔ چنانچہ دینی درسگاہوں کے فلسفۂ تعلیم میں انسان کے لئے جس طرح آزادی ایک معلوم اصول کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح یہاں یہ بھی پوری طرح معلوم ہے کہ آزادی کے حدود کیا ہیں۔ کب تک آزادی ایک رحمت ہے اور وہ کون سی حد ہے جس سے تجاوز کرنے کے بعد آزادی اس کے لئے برعکس طور پر عذاب بن جائے گی۔

۳۔ غیر دینی تعلیم گاہوں میں عام طور پر جو اصولِ حیات پایا جاتا ہے وہ اضافیت (relativity) کا اصول ہے۔ یعنی اس دنیا میں ہمارا علم اور ہمارا ہر نظریہ اضافی حیثیت رکھتا ہے نہ کہ حقیقی۔ اس فلسفہ کا نتیجہ یہ ہے کہ جدید تعلیم گاہوں میں اخلاق بھی ایک اضافی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ یہاں ہر اصول صرف

اضافی قدر رکھتا ہے۔ یہ نظریہ اپنی آخری حد پر پہنچ کر اس فلسفہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کو افادیت (utilitarianism) کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق صرف وہی چیز قابل قدر ہے جو اپنے اندر معلوم مادی افادیت رکھتی ہو، جو چیز اس صفت سے خالی ہو وہ قابل لحاظ ہی نہیں۔ اس نظریہ کے تحت تعلیم پائے ہوئے لوگ صرف یہ کر سکتے ہیں کہ وہ انسانی سماج کو ایک قسم کا حیوانی جنگل بنا دیں۔ اور اس تعلیمی نظام نے عملاً یہی کارنامہ انجام دیا ہے۔

دینی مدارس کا فلسفہ اس کے برعکس ابدی حقیقت کے اصول پر قائم ہے۔ دینی مدارس کے پاس ہر معاملہ میں اللہ کا ایک معلوم حکم موجود ہوتا ہے۔ انہیں یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ حکم سراسر برحق ہے اور اس بنا پر وہ ناقابل تغیر ہے۔ وہ ابدی طور پر قابل اتباع ہے۔ یہ فلسفہ فطری طور پر ابدی اخلاقیات (eternal ethics) کا تصور پیدا کرتا ہے۔ اس کے تحت وہ مستحکم اخلاقی نظام بنتا ہے جس میں کسی بھی حال میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔

۴۔ غیر دینی تعلیمی نظام میں ایک بڑا خلا یہ ہے کہ اس کو کسی بھی معاملہ میں نقطۂ آغاز (starting point) کا علم نہیں۔ اس کا سارا انحصار ذاتی تجربات اور مشاہدات پر ہوتا ہے۔ انسان اپنی لازمی محدودیت (limitation) کی بنا پر کبھی یہ جان نہیں پاتا کہ کسی معاملہ کا حقیقی نقطۂ آغاز کیا ہے۔ اس لئے ایسی درسگاہوں میں تربیت پائے ہوئے ذہن ابدی طور پر فکری ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں، وہ کبھی علم حقیقی کے درجہ تک نہیں پہنچتے۔ اس کے برعکس دینی درسگاہ اپنے الٰہی علم (divine knowledge) کی بنا پر اس حیثیت میں ہوتی ہے کہ وہ ہر معاملہ میں پہلے ہی قدم پر صحیح نقطۂ آغاز کو پالے اور نتیجۃً فکری ٹھوکر کھانے سے بچ جائے۔

اس کی ایک مثال ارتقاء حیات کا فلسفہ ہے۔ اس معاملہ میں غیر دینی درسگاہوں میں تعلیم پائے ہوئے افراد کے پاس نقطۂ آغاز کے لئے کوئی معلوم اصول موجود نہ تھا، انھوں نے اٹکل سے حیاتیاتی ارتقاء کا مفروضہ (hypothesis) قائم کیا۔ سو سال سے بھی زیادہ مدت تک اس مفروضہ کو واقعہ ثابت کرنے کے لئے بے شمار اعلیٰ دماغوں نے اس پر اپنی عمریں صرف کر دیں۔ اس پر ہزاروں بلین ڈالر خرچ کئے گئے۔ مگر ان کا مفروضہ آج بھی صرف مفروضہ ہے، بلند بانگ دعووں کے باوجود کسی بھی درجہ میں

وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ چنانچہ نظریہ ارتقاء کے محقق علماء خود یہ اعتراف کرتے ہیں کہ یہ نظریہ اب بھی صرف ایک کام چلاؤ نظریہ (workable theory) ہے نہ کہ کوئی ثابت شدہ علمی حقیقت۔

اس کے برعکس دینی درس گاہ میں تربیت پائے ہوئے انسان کا ذہن اول دن سے بالکل صاف ہوتا ہے۔ قرآن کی بنیاد پر، وہ اول دن سے اس یقین کا حامل ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کا آغاز خدائی تخلیق کے ذریعہ ہوا نہ کہ محض بے شعور مادی عوامل کے ارتقاء سے۔ اس طرح دینی درسگاہ کا ایک انسان حیاتیات کے معاملہ میں اس نقطۂ آغاز کو پہلے ہی دن پالیتا ہے جس کو غیر دینی درس گاہ میں تربیت پائے ہوئے لوگ سو سال سے زیادہ مدت تک مہنگی قسم کی علمی سرگرمیوں کے باوجود پانے میں ناکام رہے۔

۵۔ غیر دینی درس گاہ میں تعلیم پایا ہوا انسان جس فلسفۂ حیات کو لے کر وہاں سے نکلتا ہے اس کے عین فطری نتیجہ کے مطابق اس کا تصور حیات بالکل ادھورا ہوتا ہے۔ وہ آغاز حیات کو جانتا ہے مگر وہ انجام حیات کو نہیں جانتا۔ اس کو یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنی زندگی کی سرگرمیوں کو کہاں سے شروع کرے مگر اس کو یہ علم نہیں ہوتا کہ اس کی آخری منزل کیا ہے اور زندگی کے انجام کے اعتبار سے اس کو کس قسم کی تیاری کرنا چاہئے۔ وہ بظاہر اپنی زندگی کا آغاز اجالے میں کرتا ہے، صرف اس لئے کہ آخری عمر کو پہنچ کر اس کی زندگی نامعلوم اندھیروں میں بھٹک کر رہ جائے۔

دینی مدرسہ میں تعلیم و تربیت پائے ہوئے انسان کا معاملہ اس سے مکمل طور پر مختلف ہوتا ہے۔ یہاں کا تعلیم یافتہ انسان اپنے قرآنی پس منظر کی بنیاد پر پورے شعور کے ساتھ یہ جانتا ہے کہ اس کو اپنی زندگی کا سفر کہاں سے شروع کرنا ہے اور اس کی آخری منزل کیا ہے۔ ایسا انسان اس واضح یقین پر کھڑا ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا کی حیثیت راستہ کی ہے، اور اس کے بعد آنے والی آخرت کی دنیا کی حیثیت منزل کی۔

۶۔ غیر دینی درسگاہوں میں جو فلسفۂ حیات رائج ہے، اس کے مطابق انسان ایک متلاشیٔ مسرت حیوان (pleasure-seeking animal) ہے۔ اس فلسفہ کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ انسان لذت اور مسرت کے حصول کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنالے۔ چنانچہ آج غیر دینی درسگاہوں کے تعلیم پائے ہوئے تمام لوگ اسی واحد مقصد کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ غیر دینی درسگاہوں میں تربیت پائے ہوئے لوگوں کا حال ہر جگہ یہی ہے، خواہ وہ ہندستان کے لوگ ہوں یا بیرون ہندستان کے لوگ۔

اس نظریہ کا عملی تجربہ بتاتا ہے کہ وہ ہلاکت خیز حد تک غلط ہے۔ اس ذہن کے لوگ اپنی ساری عمر ان چیزوں کے حصول میں لگا دیتے ہیں جن کو وہ بظاہر خوشی و لذت کا ذریعہ سمجھتے ہیں مگر جب ہزار کوشش کے بعد وہ ان مطلوب چیزوں کا ڈھیر اکٹھا کر لیتے ہیں تو اچانک ان کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں خواہ کتنی ہی زیادہ ہوں، وہ انھیں لذت و مسرت دینے والی نہیں۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی فطری صلاحیت کے اعتبار سے لامحدود استعداد (unlimited capacity) کا مالک ہے۔ جب کہ دنیا کی ہر چیز صرف محدود خوشی اور محدود لذت ہی دے سکتی ہے۔ گویا انسان اپنی طلب کے اعتبار سے کامل تسکین چاہتا ہے جب کہ مادی چیزیں اپنی محدودیت کی بنا پر اس کو جزئی تسکین ہی دے سکتی ہیں۔ اسی فرق کا نتیجہ وہ چیز ہے جس کو اکتاہٹ (boredom) کہا جاتا ہے۔ طالب اور مطلوب کے درمیان یہ فرق اتنا زیادہ حتمی ہے کہ کسی بادشاہ کے لئے بھی اس کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں مادی ساز و سامان کی بے پناہ کثرت ہے مگر ان سامانوں نے انسان کو جو چیز دی ہے وہ صرف مایوسی (frustration) ہے نہ کہ تسکین، جس کو حاصل کرنے کے لئے یہ مادی ساز و سامان فراہم کیا گیا تھا۔

دینی مدرسہ میں تعلیم و تربیت پائے ہوئے انسان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ایسے لوگ جس فلسفۂ حیات کا سبق لے کر اپنی مادر علمی سے نکلتے ہیں وہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کے لئے ہے نہ کہ حصول مسرت کے لئے۔ یہ نقطۂ نظر ان کے رویہ کو یکسر بدل دیتا ہے۔ وہ دنیا کی کامیابی کے بجائے آخرت کی کامیابی کو اپنی منزل بناتے ہیں۔ دنیا میں عیش ڈھونڈنے کے بجائے آخرت میں جنت کا حصول ان کا نشانہ بن جاتا ہے۔

سوچ کے اس فرق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دینی مدارس میں تعلیم پائے ہوئے لوگ تعیش (luxury) کے بجائے ضرورت کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں۔ وہ فراوانی (abundance) کے بجائے قناعت کے اصول پر راضی رہتے ہیں۔ کل کی خوشی کا احساس ان کے لئے آج کے غم کو ہلکا کر دیتا ہے۔ وہ کبھی مایوسی سے دوچار نہیں ہوتے، کیوں کہ جو کچھ انھیں موجودہ دنیا میں ملتا ہے اسی کو وہ اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ ان کا سینہ حرص اور حسد جیسے منفی احساسات سے پاک ہوتا ہے۔ کیوں کہ حرص اور حسد جیسے احساسات مادی کمی کی زمین پر ابھرتے ہیں، اور دینی تعلیم کے تربیت یافتہ لوگ اپنے غیر مادی ذہن

کی بنا پر اس کمزوری سے پیشگی طور پر محفوظ ہوتے ہیں۔

یہ چند مثالیں بتاتی ہیں کہ دینی مدارس اور غیر دینی مدارس میں کتنا زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ دینی مدارس حقیقی علم پر قائم ہیں، اس کے مقابلہ میں سیکولر مدارس غیر حقیقی علم پر۔ یہ فرق بے حد بنیادی ہے۔ اس فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ جس پہلو سے بھی دونوں کے درمیان تقابل کیا جائے دینی مدارس ہر اعتبار سے سیکولر مدارس پر فائق نظر آئیں گے۔

دینی مدارس اور غیر دینی مدارس کے فرق کے بارے میں یہاں جو کچھ لکھا گیا، وہ اصولی اعتبار سے لکھا گیا ہے۔ جہاں تک عملی حیثیت کا تعلق ہے، دینی مدارس میں بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ مگر بنیادی بات یہ ہے کہ غیر دینی تعلیم گاہوں میں جو کمیاں ہیں وہ عین ان کے اصول اور فلسفہ کی بنا پر ہیں۔ اور اس اعتبار سے وہ ان کے نظام کا لازمی حصہ ہیں۔ جب کہ دینی تعلیم گاہوں میں جو کمیاں پائی جاتی ہیں وہ ان کی عملی کوتاہی کا نتیجہ ہیں نہ کہ نظریۂ تعلیم میں نقص کا نتیجہ۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ عملی کوتاہی کو اصلاحی کوشش سے دور کیا جاسکتا ہے، جب کہ نظریاتی نقص کو اس وقت تک دور نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ خود نظریہ ہی کو غلط قرار دے کر اس کو رد نہ کر دیا جائے۔

# مدرسہ کلچر

ہندستان میں یا دوسرے ملکوں میں جو سیکولر تعلیمی ادارے قائم ہیں، ان کی بنیاد مادی فلسفہ پر ہے۔ یعنی جو کچھ ہے یہی دکھائی دینے والی دنیا ہے۔ اس دنیا کے سوا کسی اور حقیقی چیز کا وجود نہیں۔ اس فلسفہ کی بنا پر سیکولر نظام تعلیم اپنے طلبہ کے اندر جو مزاج پیدا کرتا ہے وہ یہ کہ اپنی ساری طاقت مادی ترقی میں لگاؤ۔ دنیا کی خوشی (pleasure) جتنی زیادہ ممکن ہو حاصل کرو۔ تمہارے لئے سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز مادی مفاد (material interest) ہے نہ کہ غیر مادی اقدار، وغیرہ۔

اس سیکولر نظام تعلیم اور سیکولر تہذیب نے ساری دنیا کو مادہ پرست بنا دیا ہے۔ مادی فکر، مادی اخلاق اور مادی سرگرمیاں لوگوں کے اوپر اتنا زیادہ چھا گئی ہیں کہ اب یہاں مادیات کا جنگل بنتا ہوا نظر آتا ہے۔

اس وسیع صحرا میں دینی مدارس کی حیثیت گویا نخلستان کی ہے۔ دینی مدارس کی بنیاد، برعکس طور پر، غیر مادی تہذیب یا روحانی فلسفہ پر رکھی گئی ہے۔ مدارس کا پورا نصاب اور اس کا پورا نظام اس ڈھنگ پر بنا ہے کہ وہ لوگوں کو مادی سطح سے اوپر اٹھائے۔ وہ مادی کلچر کے مقابلہ میں روحانی کلچر کا متبادل (alternative) پیش کرے۔ مدارس کے نظام میں یہ مقصد کس طرح جاری و ساری ہے، اس کو میں اپنی مدرسی زندگی کے کچھ ذاتی تجربات کی روشنی میں بتانے کی کوشش کروں گا۔

۱۔ "مدرسہ کلچر" کا پہلا تجربہ مجھ کو اپنے گاؤں کے مدرسہ میں ہوا جہاں میں نے اردو اور فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یہاں اس زمانہ میں مولانا اسماعیل میرٹھی (وفات ۱۹۱۷) کی اردو ریڈریں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان ریڈروں میں بہت سلیقہ کے ساتھ اخلاقی اور روحانی تعلیمات سمو دی گئی تھیں۔ ان کو پڑھتے ہوئے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر، انہیں اپنے ذہن کا جزء بناتا رہا۔ جن کا اثر آج تک میں اپنی زندگی میں پاتا ہوں۔

ایک اردو ریڈر میں مصنف نے ایک کہانی بیان کی ہے کہ ایک اونٹ بھٹک کر جنگل میں پہنچ گیا۔ اس کی نکیل کی رسی زمین پر گھسٹ رہی تھی۔ ایک چوہے نے دیکھا تو اس کو شوق ہوا کہ میں اس اونٹ کو اپنے ہاں لے جاؤں اور اس کو اپنا مہمان بناؤں۔ اس نے اونٹ کی رسی اپنے منہ میں پکڑ لی اور اپنی بل کی

طرف چلنے لگا، اونٹ بھی اس کے پیچھے چلنے لگا۔ یہاں تک کہ دونوں وہاں پہنچ گئے جہاں چوہے کی بل تھی۔ اب چوہا بہت پشیمان ہوا کیوں کہ اس نے تقابل کر کے دیکھا تو اس کو معلوم ہوا کہ اس کی بل بہت چھوٹی ہے اور اس کے مقابلہ میں اونٹ بہت زیادہ بڑا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے لکھا تھا:

کیا کیا خیال باندھے ناداں نے اپنے دل میں  پر اونٹ کی سمائی کب ہو چوہے کے بل میں

یہ حقیقت پسندی کا پہلا سبق تھا جو مجھے اپنی زندگی میں ملا۔ اور بلاشبہہ اس دنیا میں حقیقت پسندی کے بغیر کوئی بھی کام نہیں کیا جاسکتا۔ خواہ اس کا تعلق انفرادی معاملہ سے ہو یا اجتماعی معاملہ سے۔

۲۔ مدرسۃ الاصلاح کی تعلیم کے زمانہ میں میرے ایک استاد مولانا نجم الدین اصلاحی (وفات ۱۹۹۵) مرتب مکتوبات شیخ الاسلام تھے۔ ان سے میں نے فارسی کی کئی کتابیں، مثلاً گلستاں اور بوستاں وغیرہ پڑھیں۔ فارسی زبان کی ایک امتیازی صفت یہ ہے کہ اس میں بڑے پیمانہ پر اخلاقی ادب تیار ہوا۔ اخلاقیات پر جتنی اچھی کتابیں فارسی زبان میں ہیں شاید کسی اور زبان میں نہیں۔ چنانچہ فارسی کتابوں سے مجھے حکمت اور اخلاق کی بہت سی اعلیٰ باتیں ملیں۔ استاد مرحوم نے ایک بار فارسی کا ایک شعر سنایا جو عظیم حکمت پر مشتمل ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ــــ میرے اور تمہارے درمیان صرف سننے کا فرق ہے۔ جس آواز کو تم دروازہ بند ہونے کی آواز سمجھ رہے ہو، اس کو میں دروازہ کھلنے کی آواز کے طور پر سن رہا ہوں:

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو  تو غلقِ باب و منم فتح باب می شنوم

استاد مرحوم نے اس شعر کی جو تشریح کی تھی وہ طالب علمی کے زمانہ میں زیادہ گہرائی کے ساتھ مجھ پر واضح نہیں ہوئی تھی۔ مگر یہ فارسی شعر میرے حافظہ کا جزء بن گیا۔ بعد کے مطالعہ اور تجربہ کے درمیان اس کی اہمیت اور معنویت واضح ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ میری سمجھ میں آیا کہ جو بات اس شعر میں کہی گئی ہے وہ موجودہ ناموافق دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ اس دنیا میں وہی شخص بڑی ترقی حاصل کر سکتا ہے جس کا شعور اتنا زیادہ بیدار ہو کہ وہ منفی واقعات میں مثبت پہلو تلاش کر سکے۔ وہ دروازہ بند ہونے کی آواز میں دروازہ کھلنے کی آواز سن لے۔

۳۔ جس مدرسہ میں میری تعلیم ہوئی وہاں عربوں کے کلام جاہلیت کا بہت تذکرہ تھا۔ کیوں کہ وہ لوگ قرآن فہمی کے لئے اس کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ مجھے زیادہ دلچسپی اس بات سے تھی کہ

اس جاہلی کلام میں حکمت کی باتیں کثرت سے موجود ہیں۔ بعد کے مطالعہ سے میں نے یہ جانا کہ اس کا سبب یہ تھا کہ جاہلی دور کے عربوں میں انسانی صفات (human qualities) نہایت اعلیٰ درجہ میں موجود تھیں۔ وہ نہایت زندہ لوگ تھے۔ اس کا اظہار ان کے کلام میں ہوتا تھا۔ مدرسہ کی زندگی میں عرب جاہلیت کے جو اشعار میں نے پڑھے اور سنے ان میں سے ایک یہ تھا: جب آدمی کی آبرو قابل ملامت کردار سے گندی نہ ہوئی ہو تو وہ جو چادر بھی اوڑھے وہ اس کے لئے خوبصورت ہوگی:

اذاالمرء لم یدنس من اللؤم عرضه فکل رداء یرتدیه جمیل

میرا مزاج بچپن سے یہ تھا کہ میں تکلفات کے مقابلہ میں سادگی اور ظاہر داری کے مقابلہ میں حقیقت بینی کو پسند کرتا تھا۔ اس شعر نے غالباً پہلی بار میرے غیر شعوری مزاج کو شعور کا درجہ دیا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے ایسا ہوا کہ ظواہر کی اہمیت میرے ذہن سے نکل گئی۔ میں ہمیشہ یہ دیکھنے لگا کہ کوئی چیز اصل حقیقت کے اعتبار سے کیا ہے۔ ظاہر دارانہ انداز مجھے یکسر بے معنی نظر آنے لگا۔

۴۔ میری طالب علمی کے زمانہ میں مدرسۃ الاصلاح کے ایک استاد مولانا محمد احمد لہراوی تھے۔ انہوں نے مجھ کو جو کتابیں پڑھائیں ان میں سے ایک موطا امام مالک تھی۔ حدیث کی اس کتاب کو پڑھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث اس طرح میرے ذہن کا جزء بن گئی کہ وہ پھر کبھی مجھ سے جدا نہ ہوئی۔ وہ یہ ہے: عن حمید بن عبد الرحمن بن عوف، أن رجلاً أتی الی رسول الله ﷺ فقال: یا رسول الله علّمنی کلمات أعیش بهن ولا تکثر علیّ فانسی، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: "لاتغضب" (کتاب الجامع، باب ماجاء فی الغضب) ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول، مجھ کو ایسے کلمات بتایئے جن کے ساتھ میں جیوں۔ اور وہ کلمات زیادہ نہ ہوں کہ میں بھول جاؤں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم غصہ نہ کرو۔

استاد محترم کے اندر اگرچہ کسی قدر غضب کا مزاج تھا تاہم انہوں نے اس حدیث کی جو تشریح کی وہ میرے حافظہ میں نقش ہو گئی۔ اس سے مجھے طالب علمی ہی کے زمانہ میں زندگی کا یہ بنیادی اصول مل گیا کہ آدمی کو غصہ کے حالات میں بھی غصہ کے بغیر جینا ہے۔ مزید مطالعہ کے بعد میری سمجھ میں آیا

کہ اس حدیث میں دراصل یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی کو اشتعال انگیز حالات میں بھی معتدل جواب دینا چاہئے۔ آدمی کو منفی ردعمل کی نفسیات سے مکمل طور پر پاک ہونا چاہئے حتی کہ اشتعال انگیز حالات میں بھی۔

۵۔ مدرسہ میں درسیات کے تحت جو کتابیں میں نے پڑھیں ان میں سے ایک نہج البلاغہ تھی جو خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب کے کلام پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مولانا اختر احسن اصلاحی نے پڑھائی تھی۔ وہ مولانا حمید الدین فراہی کے براہ راست شاگرد تھے۔ اس کتاب میں حکمت کی بڑی عجیب عجیب باتیں ہیں۔ گویا کہ یہ کتاب ایک کتاب حکمت (Book of wisdom) ہے۔ اس سے مجھے ابتدائی دور حیات میں تعلیم کے دوران ہی ایسی حکیمانہ باتیں معلوم ہو گئیں جو میرے لئے بعد کی زندگی میں بہت کار آمد ثابت ہوئیں۔ ان میں سے ایک، حضرت علی کا یہ قول ہے: العاقل هو الذی یضع الشیٔ مواضعه (عقل مند وہ ہے جو چیزوں کو ان کے مقام پر رکھے)۔

یہ ایک بے حد حکیمانہ کلام ہے۔ زندگی کے معاملات ہمیشہ بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ بیشتر حالات میں انسان کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ افکار کے جنگل میں صحیح فکر کے سرے کو دریافت کرے۔ وہ متنوع انتخاب (options) میں صحیح انتخاب کو معلوم کر سکے۔ وہ دو مشابہ چیزوں کے درمیان فرق کو جانے تاکہ وہ غلط انطباق کی نادانی نہ کرے۔ ایسی حالت میں وہی شخص صاحب عقل کہے جانے کے قابل ہے جو، حضرت علی کے الفاظ میں، چیزوں کو ان کے اصل مقام پر رکھ سکے۔ یہی آدمی غلط استدلال سے بچے گا۔ وہ اس سے محفوظ رہے گا کہ غلط رائے اور غلط منصوبہ بندی میں مبتلا ہو جائے اور پھر خود بھی تباہ ہو اور دوسروں کی تباہی کا سبب بنے۔ اس حکیمانہ قول نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔ اس نے ابتداء ہی سے مجھے یہ ذہن دیا کہ میں صحیح تجزیہ کرنے کی کوشش کروں تاکہ صحیح رائے پر پہنچ سکوں۔

۶۔ مدرسۃ الاصلاح کے ایک ممتاز استاد مولانا محمد شبلی ندوی تھے۔ ان سے ہم نے فقہ اور کلام کی کتابیں پڑھیں۔ ان میں سے ایک ابن رشد کی کتاب بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد تھی۔ درس کے دوران اس کی یہ عبارت سامنے آئی: فأما شرط الحرب فهو بلوغ الدعوة باتفاق. أعنی أنه لایجوز حرابتهم حتی یکونوا قد بلغتهم الدعوة، وذلك شئی مجتمع علیه من المسلمین لقوله تعالیٰ: وما کنا معذبین حتی نبعث رسولاً (کتاب الجہاد، الفصل الرابع فی شرط الحرب) یعنی جہاں

تک جنگ کی شرط کا تعلق ہے تو وہ دعوت کا پہنچنا ہے۔ اور اس پر اتفاق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے جنگ کرنا جائز نہیں یہاں تک کہ ان پر دعوت پہنچ گئی ہو۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس پر مسلمان متفق الرائے ہیں۔ اس کی بنیاد قرآن میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ہم کسی کو عذاب نہیں دیتے جب تک کہ ہم اس کے پاس رسول نہ بھیج دیں۔

استاد مرحوم نے اس عبارت کی جو تشریح کی اس سے مجھے ایک اہم دینی نکتہ ملا۔ ابتدائی دور میں وہ کسی قدر مبہم صورت میں تھا بعد کے مطالعہ سے وہ زیادہ واضح ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میری سمجھ میں آیا کہ دین اسلام میں جنگ یا ٹکراؤ صرف ثانوی انتخاب (secondary option) ہے، وہ پہلا انتخاب (first option) نہیں۔ کسی فرد یا قوم سے نزاع کی صورت پیش آئے تو پہلی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ پرامن بات چیت کے انداز میں مسئلہ کو حل کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا جائے۔ پرامن کوشش جب اتمام حجت کے درجہ کو پہنچ جائے اور اس کے باوجود فریق ثانی ٹکراؤ پر قائم رہے تو اس کے بعد ثانوی انتخاب کے طور پر جنگ قابل غور ہوگی۔

# تجربات کی روشنی میں

دینی مدرسہ میں تعلیم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی دنیا کی باتوں سے بے خبر رہ جائے۔ یہ عین ممکن ہے کہ آدمی باقاعدہ طور پر صرف دینی درس گاہ میں تعلیم پائے، اس کے باوجود وہ ان علوم و معارف سے باخبر ہو جن کو دنیا کے علوم و معارف کہا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال میں خود ہوں۔ میری باقاعدہ تعلیم دینی مدرسہ یا علماء کی صحبتوں میں ہوئی۔ مگر اس کے بعد میں نے اللہ کے فضل سے بیشتر سیکولر علوم کا مطالعہ کیا۔ پامسٹری سے لے کر اسٹرانومی تک شاید ہی کوئی علم ہو جس کو میں نے نہ پڑھا ہو۔

اس کا راز یہ تھا کہ میں نے مدرسہ سے فراغت کے بعد ذاتی محنت سے انگریزی زبان اچھی طرح سیکھ لی۔ انگریزی سیکھتے ہی میری دسترس تمام علوم تک ہو گئی۔ دوسری طرف میں اپنے دعوتی مزاج کی بنا پر ملک کے اندر اور ملک کے باہر بہت زیادہ اسفار کرنے لگا۔ اس طرح انگریزی زبان اور عمومی اختلاط (interaction) میرے لئے تمام علوم سے واقفیت کے لئے کافی ہو گیا۔ مدارس کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر زمانہ میں کثیر تعداد میں ایسے لوگ رہے ہیں جن کی تعلیم اصلاً مدرسہ میں ہوئی لیکن اس کے بعد انھوں نے دنیوی علوم میں بھی مہارت حاصل کر لی اور یہ سب ان کی ذاتی محنت سے ممکن ہوا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف علوم کو حاصل کرنے کے سلسلہ میں اصل اہمیت کھلے ذہن (open mind) کی ہے۔ اگر آدمی جمود ذہنی میں مبتلا نہ ہو، اگر وہ کھلے دل و دماغ کے ساتھ ہر چیز کو دیکھے اور ہر چیز کو پڑھے تو پوری دنیا اس کے لئے ایک عظیم درسگاہ بن جائے گی۔ وہ ہر لمحہ نئی نئی باتیں سیکھے گا۔ ہر روز وہ نئے علم سے واقفیت حاصل کرے گا۔ ڈگری کی حیثیت صرف پہچان کی ہے۔ جہاں تک علم کا تعلق ہے، اس کو آدمی ذاتی محنت سے حاصل کرتا ہے۔ اور ذاتی محنت کا دروازہ کبھی کسی کے لئے بند نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وسعت علم کے لئے اصل اہمیت اس مزاج کی ہے جو حضرت عمر فاروق کے اندر پایا جاتا تھا، جیسا کہ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: کان یتعلّم من کل احد۔ یہ بات مدرسہ کے مقاصد میں شامل ہے کہ رسمی تعلیم کے علاوہ وہ طالب علم کے اندر اس قسم کا معاملہ ذوق پیدا کرے۔ تعلیم (education) کیا ہے۔ فنی بحثوں سے قطع نظر تعلیم کا مقصد بنیادی طور پر ایک ہے، اور

وہ انسانی شخصیت کا ارتقاء (personality development) ہے۔ تعلیم کے ذریعہ پیشہ ورانہ یا پروفیشنل ڈگری حاصل کرنا ایک اضافی چیز ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد شعور انسانی کو بیدار کرنا ہے۔ اور اس کو ان حقیقتوں سے باخبر کرنا ہے جو وسیع تر زندگی میں کام آنے والی ہوں۔

میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ مدارس دینیہ، دوسری تعلیم گاہوں کی طرح اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ میں مکمل طور پر مدرسہ کی پیداوار (product) ہوں۔ اگر کوئی شخص مجھ کو ایک کامیاب انسان سمجھتا ہو تو میں کہوں گا کہ میری یہ کامیابی تمام تر مدرسہ کی دین ہے۔ مدرسہ سے مجھے وہ شعور ملا اور وہ اقدار (values) حاصل ہوئیں جو میرے لئے جدوجہد حیات میں ہر قدم پر رہنما بن گئیں۔

مدرسہ ہو یا کالج اور یونیورسٹی، کوئی بھی ادارہ کسی انسان کو مکمل علم نہیں دیتا اور نہ دے سکتا۔ انسان اپنی پختگی کی عمر کو ۳۵ سال کے بعد پہنچتا ہے جب کہ مدرسہ یا یونیورسٹی کی تعلیم اس عمر سے پہلے ہی مکمل ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی تعلیمی ادارہ کسی انسان کو کامل علم دے سکے جس طرح ایک کیلو کے برتن میں دس کیلو دودھ رکھنا ممکن نہیں اسی طرح طالب علمی کی عمر میں کسی کو کامل علم بھی نہیں دیا جا سکتا۔

یہاں میں کیمسٹری کے ایک نوبل انعام یافتہ ایچ اے۔ کریبز (H. A. Krebs) کی بات نقل کروں گا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ نوبل انعام حاصل کرنے کے لئے اصل اہمیت یہ نہیں ہے کہ دوران تعلیم آدمی کو معلومات کا انبار مل جائے۔ بلکہ ساری اہمیت اس بات کی ہے کہ آدمی کو کوئی ایسا ادارہ یا ایسا استاد مل جائے جو اس کے اندر صحیح زاویۂ نظر (attitude of mind) پیدا کر دے۔ اسی ابتدائی زاویۂ نظر کی رہنمائی میں آدمی آگے بڑھتا ہے اور ذاتی محنت سے ترقی کرتے کرتے وہ نوبل انعام تک پہنچ جاتا ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ مدرسہ کی تعلیم کا ہے۔ کوئی مدرسہ بذات خود کسی کو بڑا عالم نہیں بناتا۔ مدرسہ کا کام یہ ہے کہ وہ آدمی کو صحیح طرز فکر دے، جس کی روشنی میں وہ آئندہ اپنا علمی سفر مفید سمت میں جاری رکھ سکے۔ یہاں تک کہ وہ علم کے اعلیٰ درجہ تک پہنچ جائے۔

انسان کی استعداد ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے۔ چنانچہ حصول علم کے لئے اس کا سفر بھی ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ایسی حالت میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ ابتدائی عمر بالفاظ دیگر دور تیاری

(formative period) ہی میں اس کو مطالعہ اور استنباط کا صحیح رخ مل جائے۔ یہ رخ استاد اور ادارہ دونوں سے ملتا ہے۔ ایک لائق استاد گویا ایک زندہ لائبریری ہوتا ہے جو طالب علم کو بہترین رہنمائی دیتا رہتا ہے۔ اسی طرح ادارہ کا ماحول اگر تعمیری اور صحت مند ہو تو وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر طالب علم کی علمی شخصیت کی تکمیل میں موثر و مددگار ثابت ہوتا ہے۔

یہاں میں علامتی طور پر ان میں سے صرف چند ذاتی تجربات کا ذکر کروں گا۔ تاہم یہ کسی ایک فرد کی کہانی نہیں ہے بلکہ وہ میرے جیسے ان لاکھوں لوگوں کی کہانی ہے جن کو مدارس سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ اور پھر انھوں نے دنیا میں ایک کامیاب زندگی گزاری۔

ا۔ مدرسۃ الاصلاح میں قرآن خصوصی طور پر داخل نصاب تھا۔ یہاں مجھے یہ موقع ملا کہ میں مشہور اور ممتاز عالم مولانا امین احسن اصلاحی (صاحب تدبر القرآن) سے براہ راست قرآن کی تعلیم حاصل کروں۔ مولانا محترم اس وقت مدرسہ میں استاد تفسیر بھی تھے اور صدر مدرس بھی۔ ایک روز درس قرآن کے دوران قرآن کے تیسویں پارہ کی یہ آیت سامنے آئی: افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت۔ (الغاشیہ ۱۷) استاد محترم مولانا امین احسن اصلاحی (وفات ۱۹۹۸) نے اس موقع پر طلبہ سے سوال کیا کہ اونٹ کے سُم پھٹے ہوتے ہیں یا جڑے ہوتے ہیں۔ یعنی بیل کی مانند ہوتے ہیں یا گھوڑے کی مانند۔ اس وقت ہماری جماعت میں تقریباً ۲۰ طالب علم تھے۔ مگر کوئی بھی شخص یقین کے ساتھ اس کا جواب نہ دے سکا۔ ہر ایک الگ سے کبھی ایک جواب دیتا اور کبھی دوسرا جواب۔

اس کے بعد استاد محترم نے ایک تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ تمہارے جوابات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم لوگ اونٹ کے سُم کی نوعیت کے بارے میں نہیں جانتے۔ پھر انھوں نے عربی زبان کا یہ مقولہ سنایا "لاادری" نصف العلم (میں نہیں جانتا، آدھا علم ہے) اس کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر تم لوگ یہ جانتے کہ تم اونٹ کے سم کے بارے میں بے خبر ہو تو گویا کہ اس معاملہ میں تمہارے پاس آدھا علم موجود ہوتا۔ کیوں کہ اپنی لاعلمی کو جاننے کے بعد تمہارے اندر یہ شوق پیدا ہوتا کہ تم اپنے علم کو مکمل کرنے کے لئے یہ معلوم کرو کہ اونٹ کے سُم کیسے ہوتے ہیں۔ اگر لاادری کا شعور تمہارے اندر بیدار ہوتا تو اونٹ پر نظر پڑتے ہی تم اس کے سُم کو غور سے دیکھتے اور پھر تم اپنے نہ جاننے کو جاننا بنا لیتے۔

مدرسہ کا یہ واقعہ میرے لئے اتنا مؤثر ثابت ہوا کہ یہ میرا عمومی مزاج بن گیا کہ میں ہر معاملہ میں اپنی ناواقفیت کو جانوں، تاکہ میں اس کو واقفیت بنا سکوں۔ علمی تلاش کا یہ جذبہ مجھے ابتداءً مدرسہ سے ملا تھا۔ بعد کو میں نے اس موضوع پر مغربی مصنفین کی کچھ کتابیں پڑھیں، مثلاً اسپرٹ آف انکوائری (spirit of inquiry)۔ ان سے معلوم ہوا کہ تجسّس کا یہی جذبہ تمام علمی ترقیوں کی اصل بنیاد ہے۔ اس کی ایک مشہور مثال یہ ہے کہ ہزاروں لوگوں نے سیب کو درخت سے گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر اس معاملہ میں وہ اپنے "لاادری" کو نہیں جانتے تھے، اس لئے وہ اس کی حقیقت سے بے خبر رہے۔ نیوٹن پہلا شخص ہے جس نے اس معاملہ میں اپنے لاادری کو جانا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس معاملہ میں "ادری" کے درجہ تک پہنچ گیا۔

۲۔ مدرسہ کے نصاب کے تحت میں نے شعر وادب پر جو کتابیں پڑھیں ان میں سے ایک دیوان الحماسہ ہے۔ یہ کتاب میں نے مولانا اختر احسن اصلاحی (وفات ۱۹۸۵) سے پڑھی۔ مولانا مرحوم کو کلامِ جاہلیت پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ دیوان الحماسہ عرب جاہلیت کے شعراء کے کلام کا انتخاب ہے جس کو ابو تمام (وفات ۸۴۵ء) نے تیار کیا تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں مجھے اس دیوان کے بہت سے اشعار یاد ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض اشعار ایسے ہیں جن کا میری زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

اذا المرء اعیته المروّة ناشئاً فمطلبها کهلاً علیه شدید

جب آدمی جوانی کی عمر میں مردانگی کی صفات حاصل کرنے میں عاجز رہ جائے تو ادھیڑ عمر میں اس کو پانا اس کے لئے بہت مشکل ہے۔

اس عربی شعر کی جو تشریح استاد محترم نے کی اس سے میں نے زندگی کی اس حقیقت کو سمجھا کہ کام کرنے کی بہترین عمر جوانی کی عمر ہوتی ہے۔ جو آدمی جوانی کی عمر کو استعمال نہ کر سکے وہ زیادہ عمر کو پہنچنے کے بعد کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طالب علمی کے زمانہ ہی سے میرا یہ مزاج بن گیا کہ میں اپنے وقت کا کوئی حصہ ضائع نہیں کرتا تھا۔ رات دن کے ہر لمحہ کو میں مفید طور پر استعمال کرنے لگا۔ ابتدائی عمر سے عمل کا یہ مزاج بن جانا میرے لئے بے حد کار آمد ثابت ہوا۔ اگر میں جوانی کی عمر کو غیر ضروری چیزوں میں کھو دیتا تو بعد کو میرے ساتھ وہی المیہ پیش آتا جس کو مسٹر رشید کوثر فاروقی ایم اے

نے اپنے ایک شعر میں اس طرح نظم کیا ہے:

زیست کا راز کھلا گردش ایام کے بعد  اس کہانی کا تو آغاز تھا انجام کے بعد

۳۔ مدرسہ کے ماحول میں عملی اعتبار سے جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ رات اور دن کے درمیان پانچ وقت کی نمازیں ہیں۔ باجماعت نماز کا نظام مدرسہ کی زندگی میں مرکزی حیثیت (central position) رکھتا ہے۔ نماز اگرچہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے اللہ کی قربت تلاش کرنے کا نام ہے لیکن اس کا عملی اور ظاہری ڈھانچہ اس طرح مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مزید اس چیز کی مکمل تربیت بن جاتی ہے جس کو ڈسپلن کہا جاتا ہے۔ اس طرح ہر مدرسہ عملی طور پر نظم اور ڈسپلن کا ایک تربیتی سنٹر ہوتا ہے۔ مدرسہ کے نظام کے ساتھ ڈسپلن کا اضافہ اس کی اہمیت کو کئی گنا زیادہ بڑھا دیتا ہے۔

پنج وقتہ نماز میں ڈسپلن کا یہ پہلو فرد کی روزانہ زندگی کو منظم کرتا ہے۔ اس کے رات دن کے اوقات گھڑی کی سوئی کی طرح نظم وضبط کے ساتھ گزرنے لگتے ہیں۔ اس قسم کے منظم افراد سے جو مجموعی سماج بنتا ہے وہ اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ کوئی بھی طوفان اس کو ہلا نہ سکے۔

الفضل ما شهدت به الاعداء کے اصول پر یہاں قدیم ایران کے مجوسی سپہ سالار رستم کا ریمارک قابل ذکر ہے جو اس نے نماز کے اجتماعی پہلو پر کیا تھا۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں جب مسلم فوجیں ایران میں داخل ہوئیں تو اس وقت وہاں مسقف مسجدیں نہ تھیں۔ چنانچہ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں کھلے میدان میں باجماعت نماز ادا کرنے لگے۔ رستم نے باجماعت نماز کے منظر کو دیکھا تو اس نے چیخ کر کہا: اکلَ عمرُ کبدی، یعلّم الکلابَ الآدابَ (مقدمہ ابن خلدون، صفحہ ۱۵۲)

میں جس زمانہ میں مدرسہ میں پڑھتا تھا وہاں باجماعت نماز کی نگرانی مدرسہ کے ایک سینئر استاد مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کرتے تھے۔ وہ صبح کو فجر کی اذان کے فوراً بعد ہاسٹل میں آکر طلبہ کو جگایا کرتے تھے۔ اس وقت میں نوجوانی کی عمر میں تھا۔ میری نیند مشکل سے کھلتی تھی۔ چنانچہ مولانا مرحوم میرے بارے میں کہتے: "یہ بہت سخت سوتا ہے"۔

مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ مسجد کے وسیع اور کھلے صحن میں نماز کی صفیں کھڑی ہوئی تھیں۔ غالباً عشاء کی نماز ہو رہی تھی۔ اچانک ایک سانپ مسجد کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ صفوں سے گزرتا ہوا پیچھے کی

طرف جارہا تھا جہاں جوتے اتارے جاتے تھے۔ سانپ اگرچہ زیادہ بڑا نہ تھا تاہم سانپ تو سانپ ہے۔ مگر میں نے دیکھا کہ پوری جماعت میں کوئی بھگدڑ نہیں ہوئی۔ لوگ بدستور اپنی جگہ کھڑے رہے۔ اور سانپ لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس واقعہ کی صورت میں میں نے گویا مشاہداتی تجربہ کیا کہ نماز آدمی کے اندر کس قدر نظم وضبط پیدا کرتی ہے۔

ایک مرتبہ مدرسہ کے صدر مدرس مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم نماز کے بعد مسجد میں تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ نماز میں آپ کو مل کر عمل کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کا تعلق صرف مسجد تک نہیں ہے، مسجد سے باہر کی زندگی بھی آپ کو اسی طرح نظم واتحاد کے ساتھ گزارنی ہے۔ وہ زبردست مقرر تھے۔ تقریر کرتے ہوئے انھوں نے باب تفاعل کے چند الفاظ استعمال کیے جو عربی میں مشارکت کا مفہوم رکھتا ہے۔ مثلاً توافق، تشارك، تعامل، وغیرہ۔ اس کے بعد انہوں نے خطیبانہ انداز میں کہا: "باب تفاعل کے سارے صیغے گردان ڈالو۔" اس طرح ہر مدرسہ میں پنج وقتہ نماز باجماعت کی صورت میں اتحاد اور ڈسپلن کی تعلیم دی جاتی ہے۔ گویا ہر مدرسہ عملاً نظم اور ڈسپلن کا تربیتی سنٹر بنا رہتا ہے۔

دینی مدارس کے اس پہلو کی مزید اہمیت یہ ہے کہ مدرسہ کے نظام میں نظم اور ڈسپلن صرف ایک انسانی سلوک یا سماجی کلچر کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ نماز سے وابستہ ہونے کی بنا پر اس کو مقدس فریضہ کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیم کے مطابق، ڈسپلن کو نماز کے ساتھ جوڑ کر اس کو ایک مقدس انسانی فریضہ بنا دیا گیا ہے۔

جو لوگ مجھ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ میرے مزاج میں حد درجہ نظم اور ڈسپلن ہے۔ ڈسپلن میری طبیعت ثانیہ (second nature) بن گئی ہے۔ میرا یہ مزاج غالباً اس مسلسل تربیت کا نتیجہ ہے جو مدرسہ کے دور حیات میں مجھے حاصل ہوئی۔ مدرسہ کا عبادتی ڈسپلن میرے مزاج میں اس طرح داخل ہوا کہ وہ پھر کبھی مجھ سے جدا نہ ہوا۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہر مدرسہ گویا نظم وڈسپلن کا ایک ٹریننگ سنٹر ہے، وہ زندگی کو منظم انداز (disciplined way) میں گزارنے کی ایک مستقل تربیت گاہ ہے۔

۴۔ مدرسہ کے زمانۂ قیام کا ایک واقعہ بے حد سبق آموز ہے۔ یہ واقعہ میں نے اپنے ایک مضمون (حالات بدل سکتے ہیں) میں لکھا تھا جو ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) کے شمارہ ذیقعدہ۔ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ میں چھپ چکا ہے۔ یہ واقعہ الفرقان کے صفحات سے لے کر یہاں نقل کیا جاتا ہے:

غالباً ۱۹۴۰ کی بات ہے۔ ہمارے علاقہ میں سخت خشک سالی ہوئی۔ برسات کا موسم گزرتا جارہا تھا۔ مگر بارش کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کسان روز آنہ صبح اٹھتے ہی آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ مگر بادل کا ایک ٹکڑا بھی کہیں نظر نہ آتا تھا۔ بالآخر جب مایوسی حد کو پہنچ گئی تو یہ تحریک ہوئی کہ استسقاء کی نماز پڑھی جائے۔ مدرسۃ الاصلاح سے تقریباً دو کیلو میٹر دور ایک میدان میں مدرسہ کے طلبہ اور اساتذہ اور اطراف کی بستیوں کے مسلمان جمع ہوئے۔ مرحوم مولانا محمد سعید صاحب جو اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں استاد تھے اور جن سے میں نے حدیث پڑھی تھی، انھوں نے استسقاء کی نماز پڑھائی اور آخر میں بارش کے لئے دعا کی۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ ہم لوگ سخت چلچلاتی ہوئی دھوپ میں سفر کر کے وہاں پہنچے تھے اور اس حال میں نماز ادا کی تھی کہ جسم پسینہ سے شرابور ہو رہا تھا۔ مگر نماز سے فارغ ہو کر جب ہم لوگ واپس ہوئے تو راستہ ہی میں بارش شروع ہو گئی۔ کچھ لوگوں نے درختوں کے نیچے پناہ لی اور کچھ بھیگتے ہوئے اپنے گھروں کو بھاگے۔ (صفحہ ۴۴)

اس تجربہ میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں خدا کی مدد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ واقعہ میرے لئے اس عقیدہ کا ایک حسّی مظاہرہ بن گیا کہ "مانگو تو پاؤ گے، دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا"۔ اس وقت میری عمر ۲۰ سال کے قریب تھی جب کہ انسان چیزوں کو نہایت شدت کے ساتھ اخذ کرتا ہے۔ چنانچہ یہ تجربہ میرے شعور کا مستقل جزء بن گیا۔ وہ میری پوری شخصیت میں اس طرح شامل ہو گیا کہ پھر وہ کبھی مجھ سے جدا نہ ہو سکا۔

اس طرح کے تجربات صرف دینی مدرسہ کے ماحول میں پیش آتے ہیں۔ اس طرح مدرسہ علم کے حصول کے ساتھ روحانی تربیت کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ مدرسہ کے ماحول میں آدمی کو بار بار اللہ علی اللہ اور معرفتِ آخرت کی خوراک ملتی رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدرسہ کے ماحول میں تیار ہونے والا انسان علم اور روحانیت دونوں کا مجموعہ ہوتا ہے، نہ کہ یک طرفہ قسم کا انسان، جیسا کہ عام طور

پر سیکولر تعلیم گاہوں میں پایا جاتا ہے۔

مدرسہ کی یہ تربیت میرے لئے زندگی کے بعد کے دور میں میرا سب سے بڑا سرمایہ بنی رہی۔ کسی بڑے کام کا حوصلہ اللہ پر اعتماد کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہی سرمایہ مدرسہ سے مجھ کو حاصل ہوا۔ مجھے اپنے مقصد حیات کے اعتبار سے مادی ذرائع سے زیادہ اللہ پر بھروسہ کرنا تھا۔ اس قسم کے مشکل فیصلہ پر قائم رہنا میرے لئے زیادہ تر اسی مدرسی تربیت کی بنا پر ممکن ہو سکا۔ احیاء دعوت کا مشن جو میں نے اپنی زندگی میں اختیار کیا وہ حدیث کی زبان میں معروف دین کے مقابلہ میں اجنبی دین کے لئے کھڑا ہونا تھا۔ یہ بلاشبہہ اس آسمان کے نیچے سب سے زیادہ مشکل مشن ہے۔ اس میں آدمی کو اکیلا ہی سفر کرنا پڑتا ہے۔ پہاڑوں اور سمندروں کو عبور کرنا آسان ہے مگر اجنبی دین کو لے کر چلنا آسان نہیں۔ اللہ کے فضل سے میں اس دشوار ترین منصوبہ پر ہر قسم کی رکاوٹوں اور ناموافق حالات کے باوجود قائم رہا۔ یہاں تک کہ فضا تبدیل ہو گئی۔ اس انجام کو دیکھنے کے لئے مجھے ۴۰ سال کا صبر آزما انتظار کرنا پڑا۔ اور اس قسم کا انتظار اعتماد علی اللہ کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔

# غیر سیاسی ایمپائر

لارڈ میکالے کی مذکورہ تعلیمی اسکیم کا مطلب یہ تھا کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کو انگلش کلچر کے رنگ میں رنگ دیا جائے۔ اس وقت ہندستان کے علماء اگر یہ کرتے کہ لارڈ میکالے کے خلاف احتجاج کا طوفان برپا کرتے، انگریز وائسرائے پر بم مارتے، یا انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں آگ لگاتے تو اس کا کچھ بھی نتیجہ حاصل نہ ہوتا بلکہ اس قسم کی منفی سرگرمیاں مسلمانوں کی تباہی میں شاید کچھ اور اضافہ کر دیتیں۔ جیسا کہ ۱۸۵۷ کے متشددانہ تجربہ کے بعد پیش آیا۔

اس کے بجائے علماء اسلام نے یہ کیا کہ لارڈ میکالے کے تعلیمی منصوبہ کے مقابلہ میں ایک جوابی تعلیمی منصوبہ بنایا۔ انہوں نے خاموشی کے ساتھ پورے ملک میں مدارس قائم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔

زندگی میں جب بھی آپ کوئی منصوبہ لے کر اٹھیں تو سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ کا منصوبہ حقیقی حالات کے لحاظ سے قابل بقا (sustainable) ہے یا نہیں۔ اس دنیا میں کوئی بھی منصوبہ ہمیشہ بہت دیر میں اپنا نتیجہ دکھاتا ہے۔ شاہ بلوط (oak) کے درخت کو مکمل درخت بننے کے لئے ایک سو سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اسی طرح قومی منصوبے بھی لمبی مدت کے بعد تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ ایسی حالت میں کوئی ایسا منصوبہ کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا جو تھوڑے دن کی دھوم کے بعد اچانک ختم ہو جائے۔ اس دنیا میں وہی منصوبہ حقیقی معنوں میں منصوبہ ہے جس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ تاریخ میں مسلسل جاری رہ سکے۔

مدارس دینیہ کی تحریک اسی قسم کی ایک قابل بقا تحریک تھی۔ چنانچہ وہ آغاز کے بعد مسلسل جاری رہی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں وہ بلا رکاوٹ چلتی رہی پھر بیسویں صدی میں وہ مسلسل جاری رہی اور اب اس نے کامیابی کے ساتھ اکیسویں صدی میں قدم رکھ دیا ہے۔

اس مدت میں ہندستان میں لاکھوں کی تعداد میں مکتب اور مدرسہ اور دارالعلوم (جامعہ) قائم ہوئے۔ حتی کہ سارے ملک میں دینی اداروں اور تعلیم گاہوں کا ایک جال (network) وجود میں آگیا جو نسل در نسل لوگوں کو تعلیم یافتہ بناتا رہا۔

جیسا کہ معلوم ہے، علم زندگی کا کوئی ایک شعبہ نہیں۔ براہ راست یا بالواسطہ طور پر علم کا تعلق زندگی

کے تمام شعبوں سے جڑا ہوا ہے۔ اس طرح تقریباً ڈیڑھ سو سال کی بلا انقطاع تعلیمی جدوجہد اس نوبت کو پہنچی ہے کہ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندستان میں اب مسلمانوں کا غیر سیاسی سطح پر ایک دینی و ملی ایمپائر قائم ہو چکا ہے جو اپنی مختلف خصوصیات کی بنیاد پر قدیم پولیٹیکل ایمپائر سے کہیں زیادہ اہم اور دور رس ہے۔

اس غیر سیاسی ایمپائر کے نمونے آج ہر جگہ اور ہر روز دیکھے جا سکتے ہیں ـــــ ملک کے مختلف حصوں میں کھڑی ہوئی بلند مسجدیں، مدرسوں کی عالی شان عمارتیں، جدید وسائل سے لیس بڑے بڑے دینی اور ملی ادارے، تقریباً ہر روز ہونے والے عظیم جلسے اور کانفرنسیں، مسلم رہنماؤں کے پر شوکت دورے اور اسفار، مسلم اداروں میں بڑی مقدار میں کار اور ٹیلیفون اور فیکس اور کمپیوٹر جیسی جدید سہولیات، وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کے بہت سے مظاہر آج کثرت سے ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ جو مذکورہ قسم کے غیر سیاسی ایمپائر کا تعارف کراتے ہیں۔ وہ خاموش زبان میں یہ اعلان کر رہے ہیں کہ آج اس خطۂ ارض میں مسلم ملت کو ایسے عظیم مواقع حاصل ہیں جو سیاسی اقتدار کے زمانہ میں بھی اس کو حاصل نہ تھے۔ سیاسی اقتدار کے زمانہ میں جو کچھ صرف ایک شاہی خاندان کو حاصل ہو سکتا تھا، وہ آج پوری مسلم ملت کو حاصل ہو گیا ہے۔

علماء کی تعلیم دین کی تحریک کی یہ صفت کہ وہ قابل بقا (sustainable) تھی، بے حد اہم ہے۔ اس کے قابل بقا ہونے ہی کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ وہ مستقبل میں ظاہر ہونے والے امکانات کو پا سکے۔ چنانچہ یہ تحریک مسلسل چلتی رہی، یہاں تک کہ وہ جدید صنعتی دور میں پہنچ گئی۔ اور اس طرح وہ اس قابل ہو گئی کہ بعد کے دور میں ظاہر ہونے والے امکانات کو اپنے حق میں استعمال کر سکے۔ اگر یہ تحریک قابل بقا نہ ہوتی تو دوسری بہت سی وقتی سرگرمیوں کی طرح، جدید امکانات کے ظہور سے پہلے ہی وہ ختم ہو جاتی۔ اس طرح اس کے لئے یہ ممکن ہی نہ ہوتا کہ وہ بعد کو ظاہر ہونے والے امکانات کو اپنی ترقی کا جزء بنا سکے۔

واقعات بتاتے ہیں کہ سابق پولیٹکل ایمپائر کے کھونے پر مسلمان لمبی مدت تک مرثیہ خوانی کرتے رہے، مگر اللہ تعالیٰ نے تاریخ میں ایسی تبدیلیاں کیں کہ دنیا میں اس سے کہیں زیادہ بڑے دروازے ان کے لئے کھل گئے۔ اب یہ ممکن ہو گیا کہ یہاں ہم ایک ایسا غیر سیاسی ایمپائر کھڑا کر سکیں جو

اپنے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے سیاسی ایمپائر سے بہت زیادہ بامعنی اور مفید ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پچھلے تقریباً ڈیڑھ سو سالہ عمل کے نتیجہ میں اس خطہ ارض میں مسلمانوں کا ایک پر امن غیر سیاسی ایمپائر قائم ہو چکا ہے۔ ہر مسجد و مدرسہ اور ہر مسلم ادارہ اس ایمپائر کا ایک غیر متزلزل ستون ہے۔ آج مسلم قوم کو اس ملک میں جو بقاو استحکام حاصل ہے وہ انہیں لاکھوں اداروں (institutions) کی بدولت ہے۔ اگر یہ ادارے نہ ہوں تو کوئی شہنشاہ بھی ان کو یہ استحکام نہیں دے سکتا۔

یہ واقعہ دور جدید کی بنا پر ممکن ہوا۔ جدید تبدیلیوں نے سیاسی اقتدار کو ثانوی اہمیت کی چیز بنا دیا ہے اب طاقت کا حقیقی سرچشمہ ادارے (institutions) ہیں۔ اداروں کی سطح پر آج وہ سب کچھ مزید اضافے کے ساتھ حاصل کیا جا سکتا ہے جس کی امید پہلے محدود طور پر صرف سیاسی اقتدار سے کی جاتی تھی۔

سیاسی ایمپائر فوج کی طاقت کے زور پر بنتا ہے، اور غیر سیاسی ایمپائر اداروں (Institutions) اور تنظیمات (Organizations) کی طاقت سے قائم ہوتا ہے۔ سیاسی ایمپائر ایک شخص یا گروہ کی عظمت کا مینار کھڑا کرتا ہے۔ اور غیر سیاسی ایمپائر پوری ملت یا پوری قوم کا محل تعمیر کرتا ہے۔ سیاسی ایمپائر ایک کے اوپر دوسرے کی حکمرانی کی علامت ہوتا ہے، جب کہ غیر سیاسی ایمپائر مجموعی طور پر پوری انسانیت کی فلاح کا ضامن ہے۔ اللہ کی توفیق سے آج یہ غیر سیاسی ایمپائر اس خطہ ارض کے مسلمانوں کے لئے پورے معنوں میں قائم ہو چکا ہے۔ فالحمد لله علیٰ ذلك۔

# دور کی تبدیلی

حدیث میں آیا ہے کہ: کانت بنوا اسرائیل تسوسهم الانبیاء (فتح الباری بشرح صحیح البخاری، ۶/ ۵۷۳) یعنی بنی اسرائیل کے (دینی امور) کی نگہبانی ان کے انبیاء کرتے تھے۔

یہ صرف بنی اسرائیل کی بات نہیں، قدیم زمانہ میں یہی تمام امتوں کا معاملہ تھا۔ ہر امت کی نگرانی و نگہداشت کی ذمہ داری اس کے پیغمبر کے اوپر ہوتی تھی۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں مسلسل پیغمبر آتے رہے۔ (المؤمنون ۴۴) یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا۔ جن کے بعد نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی جو امت بڑی تعداد میں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے، اس کی نگرانی اور نگہداشت کی ذمہ داری کس کے اوپر ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کسی سیاسی حاکم پر نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری امت کے علماء پر ہے۔ یہی بات حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ: إن العلماء ورثة الانبیاء (صحیح البخاری، کتاب العلم) یعنی علماء نبیوں کے وارث ہیں۔ اس حقیقت کو ایک اور روایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: علماء امتی کأنبیاء بنی اسرائیل (یعنی میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں)۔ یہ آخری حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کے باوجود معنی کے اعتبار سے قوی ہے کیوں کہ دوسری روایتیں اس کے مفہوم کی تائید کرتی ہیں۔

امت محمدی کے علماء، ختم نبوت کے بعد، مقام نبوت پر ہیں۔ اب امت کے علماء کو وہی کام انجام دینا ہے جس کے لئے پہلے پیغمبر آتے تھے۔ یہ کام بنیادی طور پر دو ہیں ـــــ امت کے امور و مسائل کی تدبیر قرآن و سنت کی رہنمائی میں کرنا، اور اسلام کے ابدی پیغام کو تمام قوموں تک پہنچانا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام تو بہت بڑا کام ہے۔ پیغمبر جب اس کام کو انجام دیتے تھے تو ان کے ساتھ اللہ کے فرشتوں کی غیبی مدد شامل رہتی تھی۔ جو پیغمبروں کے لئے ہر کامیابی کی یقینی ضمانت تھی۔ اب جب کہ اس قسم کی غیبی مدد آنے والی نہیں ہے تو علماء اس بھاری ذمہ داری کو کیوں کر انجام دیں گے۔

اس کا جواب پیشگی طور پر قرآن میں دے دیا گیا ہے۔ قرآن میں دین کی تکمیل و استحکام کا اعلان

کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: فلا تخشوھم واخشون (المائدہ ۳) اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ دنیا میں جو انقلاب آیا، اس کے بعد دنیا کی تاریخ میں ایک نیا دور برپا ہو چکا ہے۔ آیت کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ اب خشیت انسانی کا دور ختم ہو گیا، اور انسانی تاریخ تمدنی اعتبار سے خشیت خداوندی کے دور میں داخل ہو گئی ہے۔ اب ایک ایسا دور انسانی تاریخ میں آچکا ہے جب کہ کسی کے لئے یہ ممکن ہی نہ رہا کہ وہ خدا کے دین کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔ اب سارے مواقع پورے طور پر اور عمومی طور پر کھول دئے گئے ہیں، اب اگر کوئی رکاوٹ آئے گی تو وہ خود مسلمانوں کی داخلی کوتاہی کی بنا پر ہو گی نہ کہ خارجی زیادتیوں کی بنا پر۔

قدیم بادشاہی نظام کے دور میں توحید کا اعلان کرنے پر آدمی کے اوپر آرا چلا دیا جاتا تھا (صحیح البخاری، کتاب المناقب) اب اللہ تعالیٰ نے یہ کیا کہ قدیم آمرانہ سیاست کو ختم کر کے جمہوری سیاست کا دور دنیا میں رائج کر دیا۔ اس کے تحت ہر انسان کو مکمل آزادی حاصل ہے کہ وہ جس نظریہ کو چاہے اختیار کرے اور جس نظریہ کی چاہے تبلیغ کرے۔

قدیم زمانہ میں کوئی بڑا کام کرنے کے لئے عام لوگوں کے پاس وسائل نہیں ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں اقتصادیات کا تمام تر انحصار زراعت پر تھا۔ اور زرعی زمینوں کا تنہا مالک صرف بادشاہ ہوتا تھا۔ اس لئے دینی کام کرنے کے لئے عام لوگوں کے پاس وسائل نہ ہوتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے صنعتی انفجار (industrial explosion) کی صورت میں معاشی وسائل کا سیلاب بہا دیا۔ آج حکومت کے تعاون کے بغیر ہر آدمی بڑے سے بڑا سرمایہ حاصل کر سکتا ہے اور انتہائی بڑے بڑے کام انجام دے سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آج ہندستان میں یونیورسٹیوں کی مانند بہت سی بڑی بڑی دینی درس گاہیں قائم ہیں جو تمام تر غیر سرکاری تعاون کی بنیاد پر چل رہی ہیں، جب کہ قدیم دور میں اس نوعیت کے غیر سرکاری اداروں کی مثال پانا سخت مشکل ہے۔

قدیم زمانہ میں دعوتی کام بہت محدود پیمانہ پر ہو سکتا تھا کیوں کہ اس زمانہ میں سفر کے لئے صرف حیوانات ہوتے تھے جو صرف قریب کی منزل تک انسان کو لے جا سکتے تھے۔ اس زمانہ میں پیغام رسانی کا کوئی بڑا وسیلہ نہ تھا۔ آج کمیونی کیشن کے انقلاب نے ساری صورت حال بدل دی ہے۔ آج آپ چند

گھنٹوں میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ سکتے ہیں۔ منٹوں کے وقفے میں اپنا پیغام دنیا کے کسی بھی حصہ میں پہنچا سکتے ہیں۔ پرنٹنگ پریس کے ذریعہ ایک کتاب کو کروروں کی تعداد میں چھاپ کر ہر گھر میں داخل کر سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

یہ جدید امکانات بھی آج بڑے پیمانہ پر دین کی اشاعت کے لئے استعمال کئے جارہے ہیں۔ اس مہم میں زیادہ تر مدارس دینیہ کے لوگ ہی براہ راست یا بالواسطہ طور پر شریک ہیں۔ میں خود اپنے آپ کو بھی اسی قافلۂ مدارس کا ایک فرد سمجھتا ہوں۔

مذکورہ قسم کی بے شمار تبدیلیاں جو دنیا میں آئی ہیں وہ زیادہ تر غیر مسلم قوموں کے ذریعہ آئی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان قوموں سے اللہ تعالیٰ نے بالواسطہ انداز میں اپنے دین کی خدمت کا کام لیا ہے۔ غالباً یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشگی طور پر اس حدیث میں کیا تھا: ان اللہ یؤید الدین بالرجل الفاجر (البخاری کتاب الجہاد، کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر) یعنی اللہ دین اسلام کی مدد فاجر شخص کے ذریعہ بھی کرے گا۔

امکانات و مواقع کا یہ سیلاب بلاشبہہ علماء اسلام کے لئے ایک عظیم نعمت ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ علماء کے گروہ میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اللہ کی توفیق سے اس منصوبۂ الٰہی کو سمجھا۔ اور جدید مواقع کو استعمال کرتے ہوئے بقدر امکان تجدید دین اور احیاء اسلام کا فریضہ ادا کرنے کی کوشش کی۔

میں اپنے آپ کو بھی انہی خادمان دین میں شمار کرتا ہوں۔ اللہ کی توفیق سے میں نے دور جدید کے تمام ذرائع کو دین کی اشاعت کے لئے استعمال کیا ہے — پریس، کانفرنس، ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، وغیرہ۔ میں مکمل طور پر دینی مدرسہ کی پیداوار ہوں، اس اعتبار سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرا یہ پورا دعوتی کام دینی مدارس کے تحت ظہور میں آنے والا کام قرار پاتا ہے۔ اس کا کریڈٹ سب سے پہلے مدارس دینیہ کو جاتا ہے اور اس کے بعد مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو۔

# مدارس سنٹر

ضرورت ہے کہ مدارس سنٹر کے نام سے ایک مرکزی ادارہ قائم کیا جائے۔ یہ سنٹر اس مقصد کو اجتماعی طور پر حاصل کرنے کی ایک کوشش ہوگی جس کو مختلف مدرسے انفرادی طور پر حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

۱ مدارس سنٹر کا پہلا مقصد مدارس کے درمیان اتحاد کی فضا پیدا کرنا ہے۔ یہ سنٹر مختلف مدارس کے درمیان شیرازہ کا کام کرے گا۔ اللہ کے فضل سے مدارس کے درمیان ایک قسم کے خاموش اتحاد کا ماحول آج بھی قائم ہے۔ مدارس سنٹر کا کام یہ ہوگا کہ وہ اس اتحاد کو مزید موثر اور بامعنی بنائے۔ وہ مدارس کی اجتماعی آواز کے طور پر کام کرے۔

۲ موجودہ زمانہ معلوماتی انفجار (information explosion) کا زمانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بڑے ادارے میں ایسے شعبے ہوتے ہیں جو ادارے کو عصری معلومات سے مربوط رکھیں۔ مدارس سنٹر کا ایک کام یہ ہوگا کہ وہ مدارس سے براہ راست یا بالواسطہ تعلق رکھنے والی عالمی معلومات کو جمع کرے اور مدارس کو ان سے باخبر کرتا رہے۔

حدیث میں مومن کی جو صفات بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے: ان یکون بصیراً بزمانہ (وہ اپنے زمانہ سے آگہی رکھنے والا ہو) مدارس سنٹر کا معلوماتی شعبہ اہل مدارس کے لئے اسی ضرورت کو پورا کرنے کا ذریعہ ہوگا، وہ ان کو عصری واقفیت سے مسلح کرے گا۔

۳ جیسا کہ معلوم ہے، مدارس کا موجودہ نصاب دو قسم کے علوم پر مشتمل ہے — علوم عالیہ، اور علوم آلیہ۔ جہاں تک علوم عالیہ کا تعلق ہے، وہ بلاشبہ مقدس علم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم یہ تقدس ان کے متن (text) کے لئے ہے نہ کہ ان کی تشریح و تفسیر کے لئے۔ اس لئے علوم عالیہ میں متن کو علیٰ حالہ باقی رکھتے ہوئے ان کی تشریحی اور تفسیری کتابوں میں وقت کے تقاضے کے مطابق تبدیلی ہوتی رہے گی۔

علوم آلیہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ علوم آلیہ کبھی مقدس نہیں ہوتے۔ وہ مکمل طور پر زمانی حالات اور عصری افکار کے تابع ہوتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ علوم آلیہ پر مسلسل نظر

ثانی کی جاتی رہے۔ جیسا کہ سیکولر نظام تعلیم میں عام طور پر کیا جاتا ہے۔

۴ مدارس سنٹر کا ایک کام یہ ہوگا کہ وہ مدارس کے تعاون سے ایسی فضا پیدا کریں جس میں موجودہ نصاب پر نظر ثانی کے مسئلہ کو ممکن بنایا جاسکے۔ مدارس کے حلقہ میں لمبے عرصہ سے یہ بحث جاری ہے کہ مدارس کے مروجہ نصاب پر نظر ثانی کر کے اس کو مطابق حال بنایا جائے۔ مگر عملاً اس کی طرف بہت کم پیش قدمی ہو سکی ہے۔

مدارس کے موجودہ نصاب میں قرآن اور سیرت اور تاریخ اسلام کا حصہ بہت کم پایا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ نصاب کی اس کمی کو پورا کیا جائے۔ اسی طرح حدیث کو اصلاً حدیث کے طور پر نہیں پڑھایا جاتا بلکہ اس کو فقہ کے ذیل میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس پہلو پر بھی دوبارہ غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح موجودہ نصاب میں "فرق ضالہ" کے نام پر بہت سی چیزیں داخل نصاب ہیں۔ حالاں کہ یہ فرقے قدیم فرقے ہیں جو اب عملاً معدوم ہو چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ طلبہ کو اس کے بجائے آج کے گمراہ فرقوں کے بارے میں معلومات دی جائیں، نہ کہ گذرے ہوئے فرقوں کے بارے میں۔ اسی طرح معقولات کے نام پر جو کتابیں مدارس کے موجودہ نصاب کا جزء ہیں وہ اب عملاً غیر مفید ہو چکی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کے بجائے طلبہ کو جدید معقولات سے واقف کرلیا جائے تاکہ وہ آج کے ذہن کے سامنے اسلام کی مدلل نمائندگی کر سکیں۔

اس قسم کی متعدد چیزیں ہیں جو موجودہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کا تقاضا کرتی ہیں۔ یہ نظر ثانی مدارس کے تعاون ہی کے ذریعہ انجام دی جاسکتی ہے۔ مدارس سنٹر کا ایک اہم کام یہ ہوگا کہ وہ اس نظر ثانی کے لئے حالات فراہم کرے۔

۵ مدارس کے موجودہ نصاب کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ بڑی حد تک دعوت رخی (dawah-oriented) نصاب ہے۔ اس نصاب کو بنانے والوں کے ذہن میں غالباً یہ مقصد تھا کہ طلبہ کو اس طرح تیار کیا جائے کہ وہ مدارس سے فارغ ہو کر دعوت و تبلیغ کے کام کو موثر طور پر انجام دے سکیں۔

یہ بجائے خود ایک صحیح نہج تھا۔ مگر اب زمانہ اتنا بدل چکا ہے کہ عملی طور پر دیکھا جائے تو ہمارے مدارس ایسے مخاطبین کے لئے دعاۃ تیار کر رہے ہیں جن کا اب کہیں وجود نہیں۔ مثلاً یہ نصاب طلبہ کو

قدیم "معتزلہ" کے خلاف ذہنی طور پر مسلح کرتا ہے۔ مگر آج کے جو زندہ معتزلہ ہیں ان کے خلاف یہ طلبہ اپنے آپ کو تیار نہیں پاتے۔ اسی طرح قدیم ذوق کے مطابق طلبہ کو مناظرہ کے آداب پڑھائے جاتے ہیں حالانکہ آج مناظرہ کا طریقہ متروک ہو چکا ہے اور اس کی جگہ سنجیدہ ڈائیلاگ کا طریقہ دنیا میں رائج ہو گیا ہے، مگر ہمارے فارغینِ مدرسہ اس کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ وہ جدید طرز کے سنجیدہ ڈائیلاگ میں حصہ لے سکیں۔ اسی طرح یہ فارغینِ مدرسہ قدیم طرز کی قیاسی منطق پر تیار ہوتے ہیں جب کہ آج دنیا میں سائنٹفک منطق کا دور آچکا ہے جس سے وہ آشنا نہیں ہوتے، وغیرہ وغیرہ۔

۶ نصاب کی تبدیلی کے ذیل میں ایک سوال یہ ہے کہ اس کے لئے مدرسین کہاں سے آئیں گے۔ مگر یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اس معاملہ میں ہمیں موجودہ مدرسین ہی کو تیار کر کے استعمال کرنا ہے نہ کہ نئے مدرسین کو درآمد کرنا۔ یہ عین وہی طریقہ ہے جو یونیورسٹیوں میں عام طور پر رائج ہے۔ وہ یہ کہ جب بھی یونیورسٹی کے نصاب میں کوئی تبدیلی کی جاتی ہے یا کوئی نیا تقاضا سامنے آتا ہے تو اس کے لئے وہ نئے استاد لانے کے بجائے اساتذہ کی موجودہ ٹیم ہی کو مختلف طریقہ سے تیار کرتے ہیں۔ مثلاً ریفریشر کورس (refresher course) یا کریش کورس (crash course) چلانا۔ ان کو باہر کی یونیورسٹیوں میں ٹریننگ کے لئے بھیجنا۔ اس مقصد کے لئے انھیں تدریسی کام سے باقاعدہ فراغت دی جاتی ہے تاکہ وہ دلجمعی کے ساتھ اپنے کو نئے تقاضوں کے مطابق تیار کر سکیں۔

سیکولر تعلیمی اداروں میں مسلسل یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اساتذہ کے تدریسی معیار کو بڑھایا جائے۔ اس مقصد کے لئے انھیں مختلف قسم کے مواقع دئے جاتے ہیں۔ مثلاً ریسرچ کے لئے بامشاہرہ چھٹی دینا۔ بیرونی سفروں کا انتظام کرنا۔ پروموشن وغیرہ کے ذریعہ ایسے محرک (incentive) فراہم کرنا جو ان کے لئے اپنے آپ کو مسلسل تیار کرنے میں مددگار ثابت ہوں، وغیرہ۔

۷ اس سلسلہ میں ایک کام یہ ہے کہ معہد العلماء یا اور کسی نام سے ایک شعبہ قائم کیا جائے جس کا مقصد عصری تقاضوں کے مطابق علماء کی تیاری ہو۔ منتخب نوجوان علماء متعین مدت کے لئے یہاں بلائے جائیں اور ان کو انگریزی زبان اور عصری معلومات سے بقدر ضرورت مسلح کیا جائے تاکہ وہ دورِ جدید میں اسلام کی موثر نمائندگی کر سکیں اور جدید اسلوب میں اسلام کا پیغام آج کے انسان تک پہنچا سکیں۔

اس سلسلہ میں یہاں میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کروں گا۔ میرے اس تجربہ میں دوسرے لوگ بھی ایک عملی سبق پا سکتے ہیں۔

میں نے مدرسہ کی تعلیم کے زمانہ ہی میں ابتدائی انگریزی سیکھ لی تھی۔ لیکن انگریزی زبان میں اپنی استعداد کو بڑھانے اور اس کے ذریعہ جدید طبقہ تک اسلام کا پیغام پہنچانے کا جذبہ میری زندگی میں بعد کو شامل ہوا۔ اور آخر کار یہی میری زندگی کا اصل مشن بن گیا۔

انگریزی کو دعوت کا ذریعہ بنانے کا جذبہ میرے اندر کیسے پیدا ہوا، اس کے مختلف اسباب ہیں۔ ان میں سے ایک بلاشبہہ وہ ہے جو علماء اسلام سے تعلق رکھتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے علماء کو یہ احساس ہوا کہ عصری تقاضوں کے مطابق اسلام کی خدمت کرنے کے لئے انہیں مغربی زبان بھی سیکھنا چاہئے۔ مثال کے طور پر مولانا شبلی نعمانی نے علی گڈھ میں پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھنے کی کوشش کی اگرچہ وہ اس کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ میں مدرسۃ الاصلاح میں اپنی تعلیم کے زمانہ میں دیکھتا تھا کہ میرے استاد مولانا اختر احسن اصلاحی ڈکشنری کی مدد سے انگریزی کتاب پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اگرچہ مجھے نہیں معلوم کہ ان کی یہ کوشش کہاں تک پہنچی۔ اس سلسلہ کا ایک سبق آموز واقعہ وہ ہے جو مولانا محمد قاسم نانوتوی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس واقعہ کو مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب سے لے کر ملخصاً یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"حج کے سفر (۱۸۷۸ء) میں مولانا نانوتوی سے جہاز کے یورپین کپتان نے مذہبی سوالات کئے جن کا جواب "ترجمان" کے ذریعہ دیا گیا۔ کپتان آپ کے جوابوں سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا مولانا نانوتوی نے اس کے بعد عزم کر لیا تھا کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد ہندستان پہنچ کر وہ خود انگریزی زبان سیکھنے کی کوشش کریں گے۔ مولانا نانوتوی کا احساس تھا کہ ترجمان کے بغیر براہ راست تقریر سے کپتان زیادہ متاثر ہو سکتا تھا۔ مطلب جس کا یہی ہو سکتا ہے کہ دوسروں تک دین کی دعوت پہنچانے کے لئے انگریزی جیسی زبانوں کے سیکھنے کو بھی حضرت والا نے اپنے "دینی مجاہدات" کی فہرست میں شامل کر لیا تھا" (سوانح قاسمی از مولانا مناظر احسن گیلانی مطبوعہ دار العلوم دیوبند، صفحہ ۲۹۹۔۳۰۰، جلد۔دوم)

اس قسم کے مختلف واقعات ہیں جن کے ذریعہ میرے اندر یہ داعیہ پیدا ہوا کہ میں مدرسہ کی تعلیم کے بعد انگریزی زبان کو سیکھوں اور جدید علوم کا مطالعہ کروں۔ تاکہ میں اپنی دعوتی ذمہ داریوں کو زیادہ مؤثر طور پر ادا کر سکوں۔

میں کبھی کسی انگریزی اسکول میں داخل نہیں ہوا مگر مدرسہ کی تعلیم کے بعد لمبی مدت تک ذاتی محنت کے ذریعہ میں نے انگریزی زبان سیکھی۔ میں اس قابل ہو گیا کہ براہ راست ہر قسم کی انگریزی کتاب کا مطالعہ کروں اور ان سے ضروری مواد حاصل کر سکوں۔ میں تقریباً چالیس سال سے ہندستان کے اندر اور ہندستان کے باہر انگریزی داں حلقوں میں اسلام کا پیغام پہنچانے کی مسلسل کوشش کر رہا ہوں۔

عربی اور انگریزی دونوں زبان سے واقفیت حاصل کرنے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ میں ایک بین اقوامی دعوتی مشن جاری کر سکا۔ اس دعوتی مشن کا آغاز تو بہت پہلے ہو چکا تھا لیکن انگریزی زبان کے اعتبار سے اس کا باقاعدہ آغاز ۱۹۸۴ میں ہوا جب کہ میں نے انگریزی ماہنامہ "الرسالہ" کا اجراء نئی دہلی سے کیا جو الحمد للہ اب تک جاری ہے اور ملک کے اندر اور ملک کے باہر انگریزی داں حلقوں میں دین کی اشاعت کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ درجنوں کی تعداد میں انگریزی کتابیں چھپ کر عالمی سطح پر پھیل رہی ہیں حتی کہ اب یہ دعوتی مشن انٹرنیٹ تک پہنچ چکا ہے۔ اور اس کا اپنا ویب سائٹ بھی کھولا جا چکا ہے۔

اللہ کا یہ خصوصی فضل ہے کہ اس پر امن دعوتی مشن کے ذریعہ اسلام کی اشاعت کا کام بین اقوامی سطح پر انجام پا رہا ہے۔ اس دعوتی مشن میں میرے ساتھ بہت سے اللہ کے بندے لگے ہوئے ہیں۔ ہماری اب تک کی کوششوں سے مختلف ملکوں میں ہزاروں لوگ اسلام کے سایۂ رحمت میں داخل ہو چکے ہیں۔

عربی زبان اور دینی علوم کی تکمیل کے بعد انگریزی زبان کا حصول میرے لئے بے حد مفید ثابت ہوا۔ اسی دوطرفہ علم کا یہ نتیجہ ہے کہ میرے لئے یہ ممکن ہوا کہ میں بین اقوامی کانفرنسوں میں اسلام کی نمائندگی کر سکوں۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر مجھے بار بار اس قسم کے مواقع ملے۔ اگر میں انگریزی زبان سے بے خبر ہوتا تو میرے لئے یہ ممکن نہ ہوتا کہ میں دور جدید کے دعوتی مواقع کو اس طرح استعمال کر سکوں۔

۸ مدارس سینٹر کا ایک کام یہ بھی ہوگا کہ وہ مدارس کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنے کا منظم اہتمام کرے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ غلط فہمیاں بے بنیاد ہیں لیکن وہ اتنی زیادہ پھیلی ہوئی ہیں کہ

اس سے صرف نظر کرنا کسی بھی طرح درست نہیں۔

اس سلسلہ میں ایک سبق آموز واقعہ یہاں قابل ذکر ہے۔ کچھ عرصہ پہلے حکومت ہند کے ایک اعلیٰ ذمہ دار ٹیلی فون کر کے میرے پاس آئے۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک خاص مسئلہ میں آپ سے مشورہ کرنے کے لئے آیا ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ نومبر 1999 میں انڈین ائر لائنز کا ایک جہاز جب ہائی جیک کر کے نیپال سے قندھار لے جایا گیا تو اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے میں قندھار گیا تھا۔ وہاں میری ملاقات کچھ افغانی نوجوانوں سے ہوئی۔ ان سے ہم نے پوچھا کہ کیا آپ لوگ سیاحت کے لئے انڈیا آنا پسند کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں، جب ہم نے پوچھا کہ آپ انڈیا کے کن مقامات کو دیکھنا چاہیں گے تو انہوں نے سب سے پہلے دیو بند کا نام لیا۔ مزید سوال پر انہوں نے بتایا کہ ہم کو وہاں جانے سے دل چسپی اس لئے ہے کہ ہم بھی دیو بندی ہیں۔

حکومت کے مذکورہ ذمہ دار کی بات چیت سے اندازہ ہوا کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دیو بند شاید جنگجوئی کی تربیت کا سینٹر ہے۔ افغانستان میں نیز ہندستان کی سرحد پر جو تشدد عرصہ سے جاری ہے اس کی فکری تربیت کا مرکز شاید دیو بند ہے۔

ان کی یہ بات سن کر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا کہ دیو بندی تو میں بھی ہوں۔ میری تعلیم مدرسۃ الاصلاح میں ہوئی۔ اس مدرسہ کا سنگ بنیاد دیو بند کے مولانا اصغر حسین نے رکھا تھا جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے شاگرد تھے۔ پھر میں نے ان کو بتایا کہ دیو بندی یا دیو بندیت سے مراد وہ مسلک ہے جس میں اتباع سنت پر زور دیا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے ان افغانی نوجوانوں نے اپنے کو دیو بندی بتایا۔ کیوں کہ افغانستان کے لوگ عرصہ دراز سے دینی تعلیم کے لئے دیو بند آتے رہے ہیں۔ اور وہ اپنے شرعی مسلک کے اعتبار سے دیو بند کے علماء پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس معاملہ کا سیاسی تشدد یا جنگ جوئی سے کوئی تعلق نہیں۔ میری اس وضاحت کے بعد وہ پوری طرح مطمئن ہو گئے۔

مدارس دینیہ کے خلاف اس قسم کی غلط فہمیاں بڑی تعداد میں ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ دراصل یہی غلط فہمیاں ہیں جن کی بنا پر مدارس کے خلاف طرح طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں، مثلاً مدارس پر کنٹرول کرنے کے لئے قانون بنانا یا کچھ لوگوں کی طرف سے بھارتیہ کرن کا نعرہ لگایا جانا۔ یا کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ یہ

مدارس قومی یکجہتی یا نیشنل فکر پیدا کرنے میں رکاوٹ ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ یہ مدرسے جب تک قائم ہیں اس وقت تک ملک میں مجموعی ترقی نہیں ہو سکتی، کیوں کہ وہ مسلمانوں کو ملک کی مین اسٹریم میں داخل ہونے میں روک بنے ہوئے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

یہ الزامات بلاشبہہ بے اصل اور بے بنیاد ہیں اور اگر سنجیدہ انداز میں کوشش کی جائے تو یقینی طور پر ان کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ مجوزہ مدارس سنٹر کا ایک ضمنی یا جزئی کام یہ بھی ہوگا کہ وہ مناسب انداز میں ان غلط فہمیوں کی تردید کرے۔ وہ بروقت ان کی حقیقت سے لوگوں کو واقف کرائے۔ غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ایک اسلامی کام ہے جس کو قرآن میں تبیین کہا گیا ہے۔

مدارس سنٹر کا اصل ایجابی کام یہ ہوگا کہ وہ مدارس اور اس کے نظام سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ باخبر کرائے۔ وہ لوگوں کے سامنے مدارس کی صحیح تصویر پیش کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ مدارس کا صحیح تعارف ہی مدارس کے خلاف غلط فہمیوں کی کافی اور یقینی تردید ہے۔

مدارس سنٹر کا ایک کام یہ ہوگا کہ وہ ملک میں پھیلے ہوئے مدارس کے بارے میں معلومات جمع کرے۔ وہ ان کے درمیان اتحاد کی فضا قائم کرے۔ وہ مدارس کے مشترک مقاصد کے حصول کے لئے عمل کرے۔ وہ مدارس کے جال کو انفرادی دائرہ سے نکال کر ایک وسیع مشترک مجموعہ بنا دے۔

خلاصہ یہ کہ مدارس سنٹر داخلی اعتبار سے مدارس کے لئے شیرازۂ اتحاد ہوگا اور خارجی اعتبار سے مدارس کا اجتماعی نمائندہ۔ ایک اعتبار سے وہ مدارس کے استحکام کی علامت ہوگا اور دوسرے اعتبار سے مدارس کی آفاقیت کا محافظ۔ مدارس سنٹر کے قیام کی صورت میں مدارس کی افادیت اور مدارس کی طاقت دونوں میں نمایاں اضافہ ہو جائے گا۔ مدارس سنٹر گویا ایک غیر سیاسی ایمپائر کی غیر سیاسی راجدھانی ہوگا۔ وہ بیک وقت مرکز ملت بھی ہوگا اور اسی کے ساتھ مرکز مدارس بھی۔

# ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

## ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچہ ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

## زرتعاون الرسالہ

| ہندستان کے لئے | بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک) | (بحری ڈاک) |
|---|---|---|
| ایک سال Rs. 110 | ایک سال $ 20/ £10 | $ 10/ £5 |
| دو سال Rs. 200 | دو سال $ 35/ £18 | $ 18/ £8 |
| تین سال Rs. 300 | تین سال $ 50/ £25 | $ 25/ £12 |
| پانچ سال Rs. 480 | پانچ سال $ 80/ £40 | $ 40/ £18 |

# ISLAMIC BOOKS

| | |
|---|---|
| Tell Me About Hajj *(with colour pictures)* | 295/- |
| Tell Me About the Prophet Muhammad *(with colour pictures)* | 345/- |
| Allah is Known Through Reason *(with colour pictures)* | 345/- |
| The Miracle in the Ants *(with colour pictures)* | 295/- |
| The Quran | 295/- |
| The Quran: An Abiding Wonder | 145/- |
| The Call of the Qur'an | 95/- |
| The Koran | 195/- |
| Heart of the Koran | 195/- |
| The Soul of the Quran | 145/- |
| Presenting the Quran | 125/- |
| The Moral Values of the Quran | 125/- |
| The Basic Concepts in the Quran | 195/- |
| A Treasury of the Quran | 75/- |
| The Quran for all Humanity | 75/- |
| The Beautiful Commands of Allah | 125/- |
| The Beautiful Promises of Allah | 175/- |
| The Wonderful Universe of Allah | 85/- |
| Muhammad: A Prophet for all Humanity | 195/- |
| Muhammad: A Mercy to all the Nations | 250/- |
| Words of the Prophet Muhammad | 75/- |
| The Sayings of Muhammad | 75/- |
| The Life of the Prophet Muhammad | 75/- |
| Muhammad: The Hero as Prophet | 75/- |
| History of the Prophet Muhammad | 75/- |
| An Islamic Treasury of Virtues | 195/- |
| A-Z Steps to Leadership | 95/- |
| Islam and Peace | 150/- |
| Introducing Islam | 195/- |
| The Moral Vision | 145/- |
| Principles of Islam | 145/- |
| The Muslim Prayer Encyclopaedia | 295/- |
| After Death, Life! | 195/- |
| Living Islam: Treading the Path of Ideal | 250/- |
| A Basic Dictionary of Islam | 250/- |
| The Muslim Marriage Guide | 250/- |
| The Essential Arabic | 175/- |
| Indian Muslims | 65/- |
| God Arises | 125/- |
| Islam: The Voice of Human Nature | 40/- |
| Islam: Creator of the Modern Age | 70/- |
| Woman Between Islam and Western Society | 145/- |
| Woman in Islamic Shari'ah | 125/- |
| Islam As It Is | 70/- |
| Religion And Science | 45/- |
| Man Know Thyself | 8/- |
| Muhammad: The Ideal Character | 8/- |
| Tabligh Movement | 40/- |
| Polygamy and Islam | 7/- |
| Hijab in Islam | 20/- |
| Concerning Divorce | 7/- |
| The Way to Find God | 25/- |
| The Teachings of Islam | 50/- |
| The Good Life | 45/- |
| The Garden of Paradise | 45/- |
| The Fire of Hell | 45/- |
| Islam and the Modern Man | 25/- |
| Uniform Civil Code | 10/- |

Goodword
B·O·O·K·S

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 462 6666, 462 5454, 4611128
Fax: 469 7333, 464 7980 email: skhan@vsnl.com

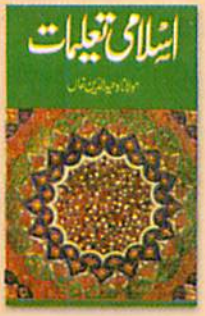

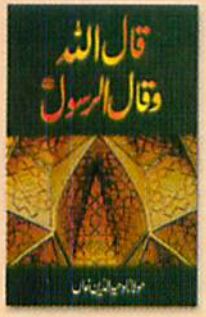

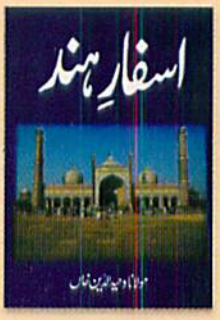


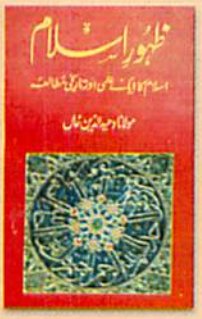

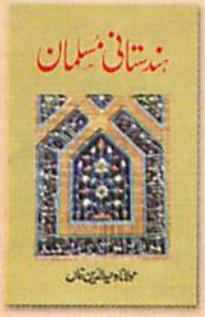

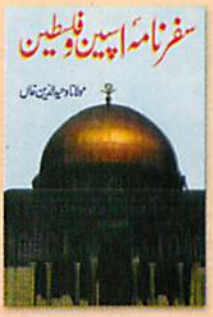


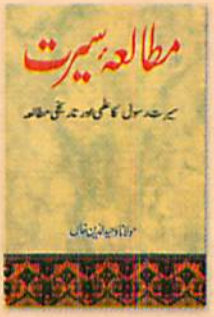


Delhi Postal Regd. No. DL/11154/2000

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 462 6666, 462 5454, 4611128
Fax: 469 7333, 464 7980 email: skhan@vsnl.com